بسم اللہ الرحمن الرحیم

انما بعثت معلما

نام کتاب:۔ غامدیت کیا ہے؟

ترتیب :۔ خادم اہل سنت، محمد عبدالرحیم چاریاری

طباعت :۔ اول

تصحیح :۔ مفتی محمد اعظم ہاشمی صاحب

ناشر :۔ جامعہ حنفیہ، امداد ٹاؤن، شیخوپورہ روڈ، فیصل آباد

﴿ملنے کے پتے﴾

1:۔ مکتبہ اہل سنت، 12 رسول پلازہ، امین پور بازار، فیصل آباد

2:۔ دفتر تحریک خدام اہل سنت مدنی مسجد، چکوال

3:۔ دفتر ماہنامہ حق چار یار رضی اللہ عنہم مدینہ بازار، ذیلدار روڈ، لاہور

4:۔ مکتبہ قاسمیہ، مکتبہ سید احمد شہید، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور

5:۔ مکتبہ عارفی، جامعہ امدادیہ، ستیانہ روڈ فیصل آباد

6:۔ کتب خانہ رشیدیہ، راولپنڈی

7:۔ جامع زکریا، مخدوم پور، پہوڑاں ضلع خانیوال

8:۔ مکتبہ امدادیہ، ٹی بی ہسپتال روڈ، ملتان

9:۔ مکتبہ عمر فاروق، نزد جامعہ فاروقیہ، شاہ فیصل کالونی، کراچی

10:۔ مکتبہ اہل سنت والجماعت، چک نمبر 87 جنوبی، سرگودھا

11:۔ مکتبہ مدنیہ نزد تبلیغی مرکز، بہاولپور

12:۔ دارالعلوم دینیہ، پتوکی ضلع قصور

بسم الله الرحمن الرحيم

اللهم صل على محمد وعلى آل محمد

كما صليت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم

انك حميد مجيد

اللهم بارك على محمد وعلى آل محمد

كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم

انك حميد مجيد

محمد رسول الله والذين معه اشداء على الكفار رحماء بينهم

خدام اہل سنت کی دُعا

از قلم حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحبؒ

خدایا اہل سُنّت کو جہاں میں کامرانی دے — خلوص و صبر و ہمت اور دیں کی حکمرانی دے

تیرے قرآن کی عظمت سے پھر سینوں کو گرمائیں — رسولؐ اللہ کی سُنّت کا ہر سُو نور پھیلائیں

وہ منوائیں نبیؐ کے چار یاروںؓ کی صداقت کو — ابو بکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و حیدرؓ کی خلافت کو

صحابہؓ اور اہل بیتؓ سب کی شان سمجھائیں — وہ ازواجؓ نبی پاکؐ کی ہر شان منوائیں

حسنؓ کی اور حسینؓ کی پیروی بھی کر عطا ہم کو — تو اپنے اولیاء کی بھی محبت دے خدا ہم کو

صحابہؓ نے کیا تھا پرچم اسلام کو بالا — انہوں نے کر دیا تھا روم و ایراں کو تہ و بالا

تیری نصرت سے پھر ہم پرچم اسلام لہرائیں — کسی میدان میں بھی دشمنوں سے ہم نہ گھبرائیں

تیرے کن کے اشارے سے ہو پاکستان کو حاصل — عروج و فتح و شوکت اور دیں کا غلبۂ کامل

ہو آئینی تحفظ ملک میں ختم نبوت کو — مٹا دیں ہم تیری نصرت سے انگریزی نبوت کو

تو سب خدام کو توفیق دے اپنی عبادت کی — رسول پاکؐ کی عظمت، محبت اور اطاعت کی

ہماری زندگی تیری رضا میں صرف ہو جائے — تیری راہ میں ہر ایک سنّی مسلماں وقف ہو جائے

تیری توفیق سے ہم اہل سنت کے رہیں خادم — ہمیشہ دینِ حق پر تیری رحمت سے رہیں قائم

نہیں مایوس تیری رحمتوں سے مظہرؔ ناداں

تیری نصرت ہو دنیا میں قیامت میں تیری رضواں

انتساب

امام المتکلمین، قائدِ اہلسنت، وکیلِ صحابہؓ

حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحبؒ

خلیفہ مجاز شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ

کے نام کرتا ہوں

یکے از خدام: پیر طریقت قطب العصر مولانا ابومعاویہ

سید محمد امین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (فاضل دیوبند)

عبدالرحیم چاریاری

||||| آئینہ مضامین |||||

تقریظ

جانشین قائد اہل سنت، پیر طریقت، وکیل صحابہ **مولانا قاضی ظہور حسین اظہر** مدظلہ (چکوال)

امیر تحریک خدام اہل سنت والجماعت پاکستان

بسم اللہ حامدًا ومصلیًا ومسلّمًا!

آج کے ترقی یافتہ دور میں مطالعہ وتحقیق کا رجحان بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ جس کی ضرورت وافادیت سے کسی ذی شعور کو انکار نہیں ہوسکتا۔ تاہم اُمت کے منتخب اہل علم کی اکثریت کی رائے کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ مطالعاتی ذوق بسا اوقات جادۂ مستقیم سے انحراف کا باعث بن جاتا ہے۔

یہی معاملہ قریب زمانہ میں جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ودیگر جدید اہل تحقیق کے ساتھ ہوا۔ اور اسی صورتحال سے ٹی وی گفتگو کے ذریعے شہرت پانے والے جناب جاوید احمد غامدی صاحب دوچار ہوئے ہیں۔ موصوف نئی تحقیق میں اُمت مسلمہ کے تواتر کو نظر انداز کرتے ہوئے بیسیوں مسلمہ نظریات میں الگ رائے قائم کرتے ہیں اور ایسے دور میں جب کہ اتحاد واتفاق کی ضرورت مزید بڑھ گئی ہے۔ انتشار وافتراق کا باعث بن رہے ہیں۔

غامدی صاحب کے اپنے نظریات پر اہل علم کی جانب سے گرفت کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ ''غامدیت کیا ہے؟'' بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جسے مولانا عبدالرحیم چار یاری زید مجدھم نے ترتیب دیا ہے۔ چند قابل توجہ امور کی طرف نشاندہی کردی گئی ہے۔ مزید گنجائش بھی باقی ہے۔

تاہم امید ہے کہ چار یاری صاحب کی یہ کاوش غامدی صاحب کی فکر سے

متاثرین کی اصلاح وتوجہ کا باعث ثابت ہوگی۔

اور یہ بھی توقع ہے کہ جو احباب غامدی صاحب کی تائید وتوثیق کو اپنے نکتہ نظر میں درست خیال کرتے ہیں۔ اپنے رائے پر نظر ثانی فرمائیں گے۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

قاضی ظہور حسین اظہر

25-10-2009

تقریظ

شیخ التفسیر والحدیث حضرت اقدس مولانا **مفتی محمد زرولی خان** دامت برکاتہم العالیہ

مدیر الجامعۃ العربیۃ احسن العلوم گلشن اقبال، کراچی

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

دیکھا جائے تو دور حاضر نئے نئے فتنوں کے ظہور وشیوع اور فتنہ پردازوں کے اضلال وگمراہی کا دور ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہر روز طلوع ہونے والا سورج اپنے ساتھ کسی ایک فتنہ کو ساتھ لاتا ہے اور ہر فتنہ پہلے سے بڑھ کر مہلک وخطرناک ہوتا ہے اور یہ سب کچھ اتفاق نہیں بلکہ تکوینی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اُمت کو آج سے سواچودہ سو سال پیشتر ان فتنوں کی اطلاع دیتے ہوئے ان سے احتراز واجتناب کی تلقین فرمائی۔

چنانچہ سرور کائنات حضرت محمد ﷺ نے قرب قیامت میں ظاہر ہونے والے ایسے تباہ کن اور مہلک فتنوں کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا:

''بادروا بالاعمال فتناً کقطع اللیل المظلم یصبح الرجل مومناً ویمسی کافراً ویمسی مومناً ویبیع کافراً یبیع دینہ بعرض الدنیا''

صحیح مسلم، ج۲، ص۳۸۸

ترجمہ: ''ان فتنوں سے پہلے پہلے اعمال کرلو، جو اندھیری رات کی مانند ہوں گے، چنانچہ آدمی صبح کو مومن ہوگا تو شام کو کافر، شام کو مومن ہوگا تو صبح کو کافر، آدمی معمولی دنیا کے بدلے اپنی (متاع) دین وایمان فروخت کردے گا''۔

دیکھا جائے تو یہ سب کچھ آزاد فکری، ذہنی انتشار، اکابر واسلاف پر عدم

کے متعلقات۔ (۲۲) زکوۃ اور اس کے متعلقات۔ (۲۳) نماز اور اس کے متعلقات۔ (۲۴) روزہ اور صدقۂ فطر۔ (۲۵) اعتکاف۔ (۲۶) قربانی۔ (۲۷) حج وعمرہ اوران کے متعلقات۔ سنت یہی ہے اوراس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے یہ اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے، لہٰذا اس کے بارے میں اب کسی بحث ونزاع کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دین لاریب انہی دو صورتوں میں ہے (یعنی قرآن اور سنت) ان کے علاوہ کوئی چیز نہ دین ہے اور نہ اسے دین قرار دیا جاسکتا ہے۔"

(میزان، جاوید احمد غامدی، ص ۱۰)

حجیت سنت

عصر حاضر کے جدت پسندوں نے اول تو سرے سے حجیت سنت کا ہی انکار کردیا اور بعض نے سنت کی جدید تعیین کرکے اس کے دائرہ کو محدود کردیا۔ حضرت شیخ حجیت سنت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"قرآن کریم، حدیث شریف اور امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر رسول اور نبی اپنی امت کے لئے نمونہ اور اسوہ ہوتا ہے اور اسی کا قول وفعل (جو لغزش اور تخصیص کی مد میں نہ ہو) تمام امتیوں کے لئے لازم ہوتا ہے اور اس کی اطاعت واتباع کے بغیر نہ تو تقرب خداوندی حاصل ہوتا ہے اور نہ نجات اخروی ہی نصیب ہوتی ہے۔ وہ مطاع اور مقتدیٰ ہوکر آتا ہے اور امت مطیع ومقتدی کہلاتی ہے"۔

(از امام اہل سنت رحمہ اللہ، انکار حدیث کے نتائج ص ۳۴)

حجیت حدیث

عصر حاضر کے منکرین حدیث نے جب حجیت حدیث کا انکار کیا اور یہ دعویٰ کردیا کہ حدیث یقینی چیز نہیں ظنی ہے اور کوئی ظنی دین قرار نہیں دیا جاسکتا۔ (جیسا کہ مرزا قادیانی اور مودودی صاحب اور غامدی صاحب کے نظریات ہیں) حدیث کی حیثیت تاریخ کی سی ہے اور تاریخ تنقید سے بالاتر نہیں ہوتی تو حضرت شیخ امام اہل سنت رحمہ اللہ نے اس فتنہ کا خوب رد فرمایا اور بڑے مدلل انداز میں حجیت حدیث کا اثبات فرمایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

"اہل اسلام کے کسی فقہی مکتب فکر کے نزدیک حدیث شریف کی بنیاد دین اور مدار اسلام ہونے میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔ الغرض اجماع امت سے بھی حجیت حدیث ثابت ہے"۔ (احسان الباری، ص ۲۱)

"تمام اہل اسلام اس امر پر متفق ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، اتباع تابعین نے پوری محنت اور مشقت خالص دینی جذبہ اور ولولہ کامل خلوص وللہیت سے آنحضرت ﷺ کی احادیث کو اپنے سینوں اور سفینوں میں محفوظ رکھا ہے اور بے حد جرأت وبہادری سے انہوں نے یہ امانت عظمیٰ امت مرحومہ تک پہنچائی ہے۔

(انکار حدیث کے نتائج ص ۱۴۸)

داڑھی کی شرعی حیثیت

داڑھی کے سنت رسول ﷺ ہونے میں بھی کبھی کسی مسلمان کو شبہ نہیں رہا۔ ہر زمانہ کے مسلمانوں نے اسے سنت رسول ﷺ کی حیثیت سے اپنایا۔ حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی ؒ کی بوادر النوادر ص۲۲،۲۳ کے حوالہ سے حضرت شیخ الحدیث امام اہل سنت ؒ کی کتاب کے حوالہ سے مولانا عبدالحق خان بشیر صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ

"اجماع امت یہ ہے کہ ایک قُبضہ سے داڑھی کم کرنا حرام ہے"۔

(حلیۃ المسلمین، ص۵)

مزید وضاحت کرتے ہوئے حضرت شیخ الحدیث ؒ فرماتے ہیں کہ

"حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور اتباع تابعین کے دور میں قبضہ (مٹھی بھر) سے کم داڑھی کا کوئی ثبوت نہیں اور خلافت راشدہ میں بھی اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ اس مبارک دور میں تمام مسلمان از شرق تا غرب، از شمال تا جنوب جہاں بھی موجود تھے۔ داڑھی کی پابندی کرتے تھے۔ البتہ یہود و مجوس اور نصاریٰ و بد باطن فرقوں کی بات جدا ہے۔ لیکن جس زمانہ میں خلافت راشدہ نہ تھی اور اسلام کے احکام بھی من وعن نافذ نہ تھے۔ اس زمانہ میں بھی بے ریش کو انتہائی حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور حسب مقدرت اس کو سزا دی جاتی تھی۔ تاکہ دیکھنے والوں کو یہ عبرت ہو۔ چنانچہ مشہور مورخ و مفسر حافظ عماد الدین ابن کثیر الشافعی لکھتے ہیں کہ

۶۷۱ھ میں دمشق میں (ملنگوں کے) قلندریہ فرقہ کے کچھ لوگوں نے داڑھیاں منڈوا دیں تو اس وقت کے بادشاہ سلطان حسن بن محمد ؒ نے حکم دیا کہ ان کو ملک بدر کر دیا جائے اور اس وقت تک ان کو اسلامی شہروں میں داخل نہ ہونے دیا جائے جب تک کہ وہ کافرانہ شعار سے توبہ نہ کر لیں۔ حافظ موصوف (البدایہ والنہایہ، ج۱۴، ص۲۷۴ میں) لکھتے ہیں کہ یہ فعل باجماع امت حرام ہے"۔

مشہور فقیہ حافظ ابن الہمام الحنفی ؒ کی فتح القدیر، ج۲، ص۷۷ کے حوالے سے فرماتے ہیں۔

"داڑھی ترشوانا جب کہ ایک مٹھی سے کم ہو جیسا کہ بعض مغربی اور مخنث قسم کے مردوں کا فعل ہے تو اس کو کسی نے بھی مباح قرار نہیں دیا اور سب ڈاڑھی کا منڈوانا تو ہندوستان کے ہندوؤں اور عجم کے مجوسیوں کا طریقہ ہے۔ (ایضاً ص۵)

"ان تصریحات کی موجودگی میں داڑھی منڈوانے اور مٹھی سے کم ترشوانے کے حرام اور گناہ ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟ ایک طرف یہ ٹھوس حوالے ملاحظہ کریں اور دوسری طرف مودودی صاحب اور غامدی صاحب کا یہ خالص اختراعی نظریہ ملاحظہ فرمائیں۔"

چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ..... "آپ کا خیال کہ نبی ﷺ جتنی بڑی داڑھی رکھتے تھے۔ اتنی بڑی داڑھی رکھنی سنت رسول ﷺ اور اسوہ رسول ﷺ ہے۔ یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عادات رسول بعینہ وہ سنت سمجھتے ہیں جس کے جاری اور قائم رکھنے کے لئے نبی ﷺ اور دوسرے انبیاء کرام مبعوث کئے جاتے رہے۔ مگر میرے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ سنت کی صحیح تعریف نہیں بلکہ یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت

قرار دینا اور پھر ان کی اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور خطرناک تحریف دین ہے"۔ (رسائل و مسائل، ص ۲۰۸) مودودی صاحب کی بے باکی اور جرات ملاحظہ کیجئے کہ داڑھی جیسی سنت صحیحہ کی اتباع اور پیروی کرنے کو سخت قسم کی بدعت اور خطرناک تحریف دین کہتے ہیں"۔ (ایضا ص۲)

مودودی صاحب داڑھی کی سنت کو بدعت اور تحریف دین قرار دیتے ہیں

مودودی صاحب داڑھی کی سنت کو بدعت اور تحریف دین قرار دینے کے باوجود خود داڑھی سے آراستہ تھے۔ لیکن اس وقت بعض (غامدی صاحب جیسے) ایسے جدت پسند بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ جن کے چہرے اس زینت سے محروم ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب نے تو یہ فیصلہ اپنے فکر کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ہے۔ لیکن دوسرے جدت پسند یہ فیصلہ اپنی شخصیت اور صورت کو سامنے رکھ کر رہے ہیں کہ کون سی چیز سنت ہے اور کون سی سنت نہیں۔ جو چیز ان کی شخصیت میں موجود ہو، وہ سنت ہے اور جو چیز ان کی شخصیت میں شامل وداخل نہیں، وہ سنت بھی نہیں۔

داڑھی رکھنا دین کی رو سے ضروری نہیں غامدی صاحب کا نظریہ

ان کے نزدیک داڑھی رکھنا دین کی رو سے ضروری نہیں، ان سے جب یہ سوال کیا گیا کہ:

"میں نے کچھ عرصہ پہلے داڑھی رکھی مگر میری امی اور سب گھر والوں کو پسند نہ آئی کیونکہ بال ٹھیک طرح سے نہ آئے تھے۔ اب امی بار بار مجھے داڑھی کٹوانے کا کہتی ہے، کیا میں اسے کٹوا سکتا ہوں؟ جواب سے ضرور مطلع فرمائیں۔"

تو اس کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا:

"عام طور پر اہل علم داڑھی رکھنا دینی لحاظ سے ضروری قرار دیتے ہیں تاہم ہمارے نزدیک داڑھی رکھنے کا حکم دین میں کہیں بیان نہیں ہوا، لہٰذا دین کی رو سے داڑھی رکھنا ضروری نہیں ہے" (ایضا)۔

یہاں کہا گیا ہے کہ داڑھی کا حکم دین میں کہیں نہیں، سوال یہ ہے کہ دین کیا ہے؟

سنت کے ذریعے جو دین ہمیں ملا ہے، اس کے حوالے سے غامدی صاحب نے ستائیس امور کا ذکر کیا ہے، لیکن داڑھی ان میں شامل نہیں، حالانکہ احادیث صحیحہ کی رو سے ایک مسلمان کے لیے داڑھی رکھنا ضروری ہے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے:

عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ: قَصُّ الشَّارِبِ وَإِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ...... مسلم کتاب الطہارۃ

"دس خصلتیں فطرت میں سے ہیں: مونچھیں کٹوانا، داڑھی بڑھانا......"

فتح الباری میں فطرت کے مفہوم کے حوالے سے اہل علم کی کئی آراء ذکر کی گئی

ہیں جو معنی کے لحاظ سے تقریباً متفق ہیں۔ قاضی بیضاوی کے حوالے سے ابن حجر لکھتے ہیں:

وقد ردّ القاضی البیضاوی الفطرة فی حدیث الباب الی مجموع ما ورد فی معناها وهو الاختراع والجبلة والدین والسنة فقال: هی السنة القدیمة التی اختارها الانبیاء واتفقت علیها الشرائع و کانها امر جبلی فطروا علیها (فتح الباری، ج ۲، ص ۶۱۴)

''قاضی بیضاوی نے مذکورہ حدیث میں لفظ فطرت کو اس مفہوم کی روایات کے مجموعے کی طرف لوٹایا ہے اور وہ ہے اختراع، جبلت، دین، اور سنت۔ چنانچہ فرمایا کہ یہ (فطرت) وہ سنت قدیمہ ہے جسے انبیاء علیہم السلام نے اختیار فرمایا اور تمام شریعتیں اس پر متفق ہیں۔ گویا یہ ایک جبلی امر ہے جس پر اصلاً لوگوں کی تخلیق ہوئی۔''

یہاں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ داڑھی 'اہل اشراق' کی تعریف سنت پر بدرجہ اتم پورا اترتی ہے، کیونکہ ان کے نزدیک سنت:

''دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔'' (میزان، ص ۱۰)

اب دیکھئے یہاں تو صرف دین ابراہیمی کا ذکر کیا گیا جبکہ اوپر قاضی بیضاوی کے حوالے سے ذکر کیا گیا کہ فطرت سے مراد وہ چیزیں ہیں جن پر تمام انبیاء اور ان کی شرائع کا اتفاق رہا ہے۔ سنت کے حوالے سے غامدی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ہمیں قرآن کی طرح امت کے اجماع سے ملی ہے۔

اس سلسلے میں گزارش ہے یہ کہ داڑھی کے بارے میں ابن حزم ''مراتب الاجماع'' میں لکھتے ہیں:

واتفقوا ان حلق جمیع اللحیة مثلة لا تجوز

(مراتب الاجماع ابن حزم، ص ۱۵۷)

''امت کے سب علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ داڑھی مونڈنا مثلا (عیب دار کرنا) ہے اور یہ جائز نہیں۔''

اسی طرح 'موسوعة الاجماع' میں حلق اللحیة' کے عنوان کے تحت بھی عبارت موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مونڈنا جائز نہیں تو رکھنا ضروری ہوا۔

یہ امر باعث تعجب اور فہم سے بالاتر ہے کہ سنت کی شرائط (جو خود غامدی صاحب نے ذکر کی ہیں) پر پورا اترنے کے باوجود داڑھی کو آخر کس حکمت و مصلحت کے پیش نظر سنت سے خارج کر دیا گیا ہے؟

غامدی صاحب داڑھی کو سنت میں شمار نہیں کرتے

جیسا کہ ان کی بیان کردہ سنن کی فہرست سے واضح ہوتا ہے حالانکہ داڑھی حضرت ابراہیم سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک تمام انبیاء کی سنت رہی۔ دور جاہلیت میں اہل عرب داڑھی رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے بھی داڑھی رکھی، اس کا حکم بھی دیا اور تمام صحابہؓ کی داڑھی تھی۔ داڑھی کی سنت غامدی صاحب کی تعریف کے مصداق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ تمام انبیاء کی سنت رہی ہے۔ یہ دین ابراہیم کی وہ روایت ہے کہ جس پر دور جاہلیت میں بھی اکثر اہل عرب قائم تھے اور آپ ﷺ نے دین ابراہیمی کی اس روایت کو عملاً برقرار رکھا اور اس کا امت کو حکم بھی جاری فرمایا۔ بعد میں یہ

سنت صحابہ کرام کے اجماع سے ثابت ہوئی اور امت کے تواتر سے ہم تک منتقل ہوئی۔ اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث ہے:

خَالِفُوْا الْمُشْرِكِيْنَ وَفِّرُوْا اللِّحٰى وَاَحْفُوْا الشَّوَارِبَ.

(بخاری، کتاب اللباس، باب قص الشارب)

''مشرکین کی مخالفت کرو، داڑھیوں کو چھوڑ دو (بڑھنے دو) اور مونچھوں کو پست کرو۔''

ابن حجر عسقلانی 'خَالِفُوْا الْمُشْرِكِيْنَ' کی شرح میں لکھتے ہیں:

فی حدیث ابی هریرة عند مسلم خالفوا المجوس وهو المراد فی حدیث ابن عمر فانهم کانوا یقصون لحاهم ومنهم من کان یلحقها.

''حضرت ابو ہریرہ کی حدیث جو مسلم میں ہے اس میں 'خَالِفُوْا الْمُشْرِكِيْنَ' کی جگہ 'خَالِفُوْا الْمَجُوْسَ' کے الفاظ ہیں اور اس حدیث میں بھی یہی مراد ہے کیونکہ مجوسیوں کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنی داڑھیاں کاٹتے تھے اور ان میں سے بعض اپنی داڑھیاں مونڈتے تھے۔''

ابن حجر کی اس تشریح اور تاریخ وسیر کی کتب سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مشرکین مکہ بھی اپنی داڑھیوں کو چھوڑتے تھے۔

مسلم کی روایت میں الفاظ ہیں:

جُزُّوا الشَّوَارِبَ وَاَرْخُوا اللِّحٰى خَالِفُوا الْمَجُوْسَ

(مسلم کتاب الطہارۃ، باب خصال الفطرۃ)

''مونچھوں کو پست کرو اور داڑھی کو چھوڑ دو، مجوسیوں کی مخالفت کرو۔''

اللہ کے رسول ﷺ کے ان فرامین سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے دین ابراہیمی کی اس روایت کو بطور دین اس امت میں جاری کیا اور داڑھی منڈانے کو

مجوسیوں کی تہذیب قرار دیا۔

دجال کا انکار

غامدی صاحب کے نزدیک دجال ایک شخص نہیں ہے بلکہ صفت ہے اور یاجوج ماجوج ہی اصل میں دجال ہے۔ دجال سے متعلقہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ نبی ﷺ نے قیامت کے قریب یاجوج ماجوج ہی کے خروج کو دجال کے خروج سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یاجوج ماجوج کی اولاد یہ مغربی اقوام، عظیم فریب پر مبنی، فکر و فلسفہ کی علمبردار ہیں اور اسی سبب سے نبی ﷺ نے انہیں دجال (عظیم فریب کار) قرار دیا۔''

غامدی صاحب نے دجال کے شخص ہونے کا انکار کیا حالانکہ دجال کا ایک شخص ہونا اور حضرت عیسیٰؑ کا اس کو ہلاک کرنا واضح طور پر احادیث اور کتاب مقدس میں موجود ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ نے اللہ کی حمد وثنا بیان کی جیسے کہ وہ اس کے لائق ہے، پھر آپ ﷺ نے دجال کا تذکرہ کیا اور فرمایا:

اِنِّیْ اُنْذِرُكُمُوْهُ وَمَا مِنْ نَبِيٍّ اِلَّا قَدْ اَنْذَرَهٗ قَوْمَهٗ لَقَدْ اَنْذَرَهٗ نُوْحٌ قَوْمَهٗ وَلٰكِنْ سَاَقُوْلُ لَكُمْ فِيْهِ قَوْلًا لَمْ يَقُلْ نَبِيٌّ لِقَوْمِهٖ تَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ اَعْوَرُ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِاَعْوَرَ (بخاری کتاب الجہاد)

''میں تمہیں اس (دجال) سے ڈراتا ہوں اور کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس

نے اپنی قوم کو دجال سے نہ ڈرایا ہو۔ یقیناً حضرت نوح نے بھی اپنی قوم کو دجال سے ڈرایا تھا لیکن میں تمہیں دجال کے بارے میں ایک ایسی بات بتا رہا ہوں جو کہ کسی بھی نبی نے اس سے پہلے اپنی قوم کو نہیں بتائی، تم جان لو کہ دجال کانا ہے اور (معاذ اللہ) اللہ سبحانہ وتعالیٰ کانا نہیں ہے۔"

حدیث میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ ہر نبی نے اپنی قوم کو دجال سے ڈرایا اور حضرت عیسیٰ بھی اس میں شامل ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں الفاظ ہیں کہ حضرت مجمع بن جاریہؓ بیان فرماتے ہیں:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ یَقْتُلُ ابْنُ مَرْیَمَ الدَّجَّالَ بِبَابِ لُدٍّ

(ترمذی، کتاب الفتن)

"میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم دجال کو مقام 'لد' پر قتل کریں گے۔"

یہ حدیث بھی اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم دجال کو قتل کریں گے۔ احادیث مبارکہ سے قطعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دجال ایک شخص معین کا نام ہے جو قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی اس بارے میں ایک حدیث بھی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہمیں ایک دن دجال کے بارے میں ایک لمبی حدیث بیان فرمائی۔ اس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ دجال ایک دن مدینہ کا رخ کرے گا لیکن اس کے لیے شہر مدینہ میں داخلہ ممکن نہ ہوگا اور وہ مدینہ کے باہر قیام کرے گا تو ایک دن اہل مدینہ سے ایک انتہائی نیک آدمی اس کے پاس آئے گا اور وہ آدمی دجال سے کہے گا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو دجال ہے، تو

اس وقت دجال لوگوں سے کہے گا:

اَرَاَیْتُمْ اِنْ قَتَلْتُ ھٰذَا ثُمَّ اَحْیَیْتُہٗ اَتَشُکُّوْنَ فِی الْاَمْرِ فَیَقُوْلُوْنَ لَا فَیَقْتُلُہٗ فَیَقُوْلُ حِیْنَ یُحْیِیْہِ وَاللّٰہِ مَا کُنْتُ فِیْکَ قَطُّ اَشَدَّ بَصِیْرَۃً مِنِّیْ الْاٰنَ قَالَ فَیُرِیْدُ الدَّجَّالُ اَنْ یَقْتُلَہٗ فَلَا یُسَلَّطُ عَلَیْہِ (مسلم کتاب الفتن)

بھلا تم دیکھو اگر میں اس شخص کو قتل کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دوں تو کیا تم پھر بھی میرے بارے میں شک کرو گے؟ تو وہ لوگ کہیں گے نہیں، تو اس وقت دجال اس نیک آدمی کو قتل کر دے گا اور جب دجال اس نیک آدمی کو دوبارہ زندہ کرے گا تو وہ نیک آدمی اس سے کہے گا: اللہ کی قسم! اب تو مجھے تیرے بارے میں حد درجے یقین ہو گیا ہے کہ تو وہی مسیح الدجال ہے۔ پس دجال اس آدمی کو دوبارہ قتل کرنا چاہے گا لیکن کامیاب نہ ہوگا۔"

یہی وجہ ہے امت مسلمہ کے علاوہ عیسائی دنیا بھی جس دجال کو اپنی کتابوں کے حوالے سے جانتی ہے وہ ایک معین شخص ہے نہ کہ صفت، یا یاجوج ماجوج، یا امریکہ۔ میرے خیال میں صاحب قرآن کی اس تصدیق کے بعد غامدی صاحب کو شخص دجال کی آمد کا اقرار کر لینا چاہیے۔

خلاصۂ کلام

اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت اور قرآن مجید کے نزول کے بعد امت مسلمہ کے لیے اصل مآخذ و مصادر قرآن و سنت ہی ہیں۔ سابقہ کتب سماویہ اپنے اپنے ادوار میں اپنی قوموں کے لیے ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ تھیں۔ کتاب مقدس قانون سازی میں ہمارے لیے ماخذ مصدر کی حیثیت نہیں رکھتی۔ ہاں اس حد تک کہنا ٹھیک ہے کہ (حَدِّثُوْا عَنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ وَلَا حَرَجَ) جیسی تعلیمات کے مصداق

کے طور پر قوم بنی اسرائیل سے متعلقہ قرآنی واقعات اخبار وقصص کی تکمیل کے لیے ہم کتاب مقدس کی عبارات سے استفادہ کرسکتے ہیں لیکن کسی قرآنی واقعے کی تکمیل کے لیے کتاب مقدس سے کیے جانے والے اس استفادے کی بنا پر کوئی حتمی رائے قائم کرلینا (لَا تُصَدِّقُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ) کے منافی ہے۔ جہاں تک احکام میں کتاب مقدس سے استدلال کرنے کا معاملہ ہے تو اس کی کوئی دلیل نقل وعقل نہیں ملتی۔

یاجوج وماجوج مغربی اقوام ہیں

نبی کریم ﷺ نے قرب قیامت کے حوالے سے کئی پیشین گوئیاں فرمائی ہیں جنہیں آئمہ محدثین نے "اشراط الساعۃ" کے عنوان سے کتب احادیث میں روایت کیا ہے۔ انہی میں سے ایک اہم پیشین گوئی دجال سے متعلق بھی ہے۔ آپ ﷺ نے اسے ایک عظیم آزمائش (فتنہ) قرار دیا ہے۔ اس فتنہ کی سنگینی وشدت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ باقاعدہ اس سے اللہ کی پناہ طلب کیا کرتے تھے اور اسی کی تعلیم امت کو بھی دی۔

اس عظیم فتنے کے حوالے سے اہل اسلام کا اتفاقی نقطۂ نظر اور عقیدہ یہ ہے کہ وہ دجال ایک شخص معین ہے، جیسا کہ احادیث میں اس کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔

موسوعۃ الاجماع میں ہے:

مذهب اهل الحق صحة وجود الدجال وانه شخص بعينه ابتلى الله به عباده (موسوعۃ الاجماع، ج۱، ص۳۸۹)

"اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ دجال کا وجود برحق ہے اور وہ ایک شخص معین ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو آزمائے گا۔"

اس کے بعد احادیث سے ثابت شدہ اس کی صفات وافعال کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

وهذا كله مذهب اهل السنة، وجميع المحدثين والفقهاء والنظار خلافا لمن انكره وابطل امره من الخوارج والجهمية وبعض ايضاً

"اور (جو کچھ بیان ہوا) یہ سارے کا سارا اہل سنت، تمام محدثین، فقہاء اور متکلمین کا مذہب ہے، ان لوگوں کے برعکس جنہوں نے اس کا انکار کیا اور اس (دجال) کے معاملے کو خوارج، جہمیہ اور بعض معتزلہ نے باطل قرار دیا ہے۔"

یہ تو تھا دجال کے بارے میں اہل حق کا عقیدہ لیکن اہل اشراق اس مسئلہ میں بھی پوری امت سے ہٹ کر خوارج، جہمیہ اور معتزلہ کی ہمنوائی میں دجال کے شخص معین ہونے کے انکاری ہیں چنانچہ اس استفسار پر کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد، ظہور مہدی اور دجال کے بارے میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں، 'ماہنامہ اشراق' میں لکھا گیا ہے:

"دجال کا خروج ہمارے نزدیک یاجوج وماجوج کے خروج کا بیان ہے۔ دجال ایک اسم صفت ہے جس کے معنی بہت بڑے فریب کار کے ہیں۔"

(ماہنامہ اشراق، جنوری ۱۹۹۶، ص ۶۱)

ہمارا نقطۂ نظر

"ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نبی ﷺ نے قیامت کے قریب 'یاجوج وماجوج' ہی کے خروج کو دجال سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یاجوج وماجوج کی اولاد یہ مغربی اقوام، عظیم فریب پر مبنی فکر وفلسفہ کی علم بردار ہیں اور اسی سبب سے نبی ﷺ نے انہیں دجال (عظیم فریب کار) قرار دیا ہے۔ روایات میں دجال کی

ایک صفت یہ بھی بیان ہوئی ہے کہ اس کی ایک آنکھ خراب ہوگی۔ یہ بھی درحقیقت مغربی اقوام کی انسان کے روحانی پہلو سے پہلوتہی اور صرف مادی پہلو کی جانب جھکاؤ کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح مغرب کی طرف سے سورج کا طلوع ہونا بھی غالباً مغربی اقوام کے سیاسی عروج ہی کے لیے کنایہ ہے۔" ایضاً

اس اقتباس کا حاصل یہ ہے کہ دجال کوئی خاص شخص نہیں، بلکہ اس سے مراد یاجوج و ماجوج ہیں اور یاجوج و ماجوج سے مراد مغربی اقوام ہیں۔ گویا یہاں بھی فرقۂ غامدیہ پوری امت سے بالکل مختلف نقطۂ نظر رکھتا ہے جس کا سلف و خلف میں سے کوئی بھی قائل نہیں۔ اس اقتباس میں سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کو بھی کنایہ قرار دیا گیا ہے جبکہ امت کا اس کے حقیقتاً مغرب سے طلوع ہونے پر بھی اتفاق ہے۔

اہل کتاب اور ہندوؤں کو کافر و مشرک کہنے سے غامدی صاحب کا انکار

وہ امور جن میں غامدی مکتب فکر نے امت سے بالکل الگ موقف اپنایا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی بھی یہودی، عیسائی، ہندو یا دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے فرد کو کافر یا مشرک نہیں کہا جاسکتا۔ کسی سائل نے پوچھا:

"اہل کتاب کو کافر کہنا درست ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدۃ کی آیت ۷۲ میں عیسائیوں کے عقیدہ کو کفر سے تعبیر کیا ہے۔"

اس کا درج ذیل جواب دیا گیا:

"کسی کو کافر قرار دینا ایک قانونی معاملہ ہے، پیغمبر اپنے الہامی علم کی بنیاد پر کسی گروہ کی تکفیر کرتا ہے۔ یہ حیثیت اب کسی کو حاصل نہیں ہوسکتی، اب ہمارا کام

یہی ہے کہ ہم مختلف گروہوں کے عمل و عقیدہ کی غلطی واضح کریں اور جو لوگ نبی ﷺ کی نبوت کو نہیں مانتے، انہیں بس غیر مسلم سمجھیں اور ان کے کفر کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ (ماہنامہ اشراق دسمبر ۲۰۰۰، ص۵۴، ۵۵)

اسی طرح "کیا ہندو مشرک ہیں؟" کے عنوان کے تحت کہا گیا:

"ہمارے نزدیک مشرک وہ شخص ہے جس نے شرک کی حقیقت واضح ہوجانے کے بعد بھی شرک ہی کو بطور دین اپنا رکھا ہو، چونکہ اب کسی ہندو کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے شرک کی حقیقت واضح ہوجانے کے بعد بھی شرک ہی کو بطور دین اپنا رکھا ہے، لہٰذا اسے مشرک نہیں قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ قرآن کے اس حکم کا اطلاق اس پر کیا جاسکتا ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی بھی یہ اختیار نہیں رکھتا کہ وہ کسی بھی فرد کو کافر قرار دے سکے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ اس مسئلے میں علمائے اسلام کی متفقہ رائے کیا ہے۔ 'موسوعۃ الاجماع' میں "من ھو الکافر" کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔

اتفقوا علی ان من لم یؤمن باللہ تعالیٰ و برسولہ ﷺ ...... فان من جحد شیئا مما ذکرنا، اوشک فی شیء منہ و مات علی ذلک، فانہ کافر، مشرک، مخلد فی النار ابدا (موسوعۃ الاجماع، ج۲ ص۷۶۵)

"علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہ لائے گا...... پس جس نے بھی ان میں سے کسی چیز کا انکار کیا یا اس میں شک کیا اور اسی حالت میں مرگیا تو وہ کافر، مشرک اور مخلد فی النار ہوگا۔"

اسی صفحہ پر تسمیۃ اھل الکتاب کفارا" کے عنوان کے تحت یہ عبارت بھی موجود ہے:

"اتفقوا علی تسمیۃ الیھود والنصاریٰ کفارا" ایضا

تمام اہل اسلام یہود ونصاریٰ کو کافر کہتے ہیں

اب یہاں اس قسم کی کوئی قید مذکور نہیں کہ کسی کو کافر تو صرف نبی اپنے الہامی علم کی بنیاد پر ہی کہہ سکتا ہے یا کسی کو مشرک قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شرک کی حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد اس پر کار بند ہو۔ لہٰذا یہ قیود محض اہل اشراق کی اپنی وضع کردہ ہیں، اہل علم کے ہاں ان کا کوئی وجود نہیں۔

یہ منطق انتہائی عجیب ہے کہ مشرک اپنے شرک کی حقیقت سے واقف ہو ورنہ وہ مشرک نہیں، اس طرح تو کوئی مجرم جرم کے بعد یہ کہہ کر چھوٹ سکتا ہے کہ میں اسے جرم نہیں سمجھتا تو کیا ہم اسے مجرم نہیں کہیں گے؟

یہاں ایک اور پہلو بھی قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ علماء نے تکفیر کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں کئی باطل گروہوں کو کافر قرار بھی دیا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں تمام مکاتب فکر کے علماء نے متفقہ طور پر قادیانیوں کو کافر قرار دیا اور اسے آئینی طور پر بھی تسلیم کیا گیا۔ یاد رہے کہ اس فتوے کو پوری دنیا کے علماء کی تائید حاصل ہے۔

تفصیل بالا سے معلوم ہوا کہ آج بھی یہود ونصاریٰ کو کافر اور ہندوؤں کو مشرک کہا جاسکتا ہے اور یہی تمام اہل اسلام کا اجماعی نقطہ نظر ہے۔

عورت کے لئے دوپٹہ اوڑھنا شرعی حکم نہیں

اسلام دینِ عفت وعصمت ہے اور اس نے خواتین کی عزت وآبرو کے تحفظ کے لیے بطور خاص ہدایات دی ہیں۔ گھر میں، گھر سے باہر، محارم کے سامنے اور غیر محرم کے سامنے ایک مسلم خاتون کو کہاں تک اظہار زینت کی اجازت ہے، ان تمام امور کے بارے میں کتاب وسنت میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ اسلامی قانونِ معاشرت کی رو سے انتہائی قریبی اعزہ کے علاوہ ایک مسلمان خاتون کے لیے اخفاء زینت کی کم از کم حد یہ ہے کہ اس کے ہاتھوں اور چہرے کے علاوہ پورا جسم مستور رہے۔ ظاہر ہے اس میں سر پر دوپٹہ اوڑھنا ازخود شامل ہے۔ شریعت اسلامیہ میں اس کے دلائل اس قدر واضح اور قطعی ہیں کہ تاریخ اسلامی کی چودہ صدیوں تک مسلمان اس مسئلہ میں کسی بھی اختلاف سے ناآشنا رہے اور اہل علم کے مابین اس پر کامل اتفاق رہا۔ ابن حزم الظاہری اپنی کتاب "مراتب الاجماع" میں لکھتے ہیں:

واتفقوا علی ان شعر الحرۃ وجسمها حاشا وجهها ویدها عورۃ
(مراتب الاجماع، ص ۵۳)

"اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ آزاد عورت کے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ تمام جسم اور بال ستر ہیں۔"

ملت اسلامیہ کے اس متفقہ موقف کے برعکس "ادارہ المورد" کے سربراہ جناب جاوید احمد غامدی کے نزدیک دوپٹے کا مسئلہ سرے سے شرعی ہی نہیں چنانچہ اس سوال کے جواب میں کہ "دوپٹے کا شرعی حکم کیا ہے؟" جناب غامدی فرماتے

ہیں:

"دوپٹا ہمارے ہاں مسلمانوں کی تہذیبی روایت ہے، اس بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ دوپٹے کو اس لحاظ سے پیش کرنا کہ یہ شرعی حکم ہے، اس کا کوئی جواز نہیں۔"

دوپٹہ کے شرعی حکم ہونے کے تفصیلی دلائل سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہماری گزارش صرف اتنی ہے کہ اس مسئلے پر اجماع ہے اور اجماع اسی مسئلے پر ہوتا ہے جو شرعی ہو۔ اصول فقہ کی مشہور و معروف اور متداول کتاب "الوجيز في اصول الفقه" کے مصنف ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے علامہ آمدیؒ کے حوالے سے اجماع کی درج ذیل تعریف کی ہے:

الاجماع هو اتفاق المجتهدين من الامة الاسلامية في عصر من العصور، على حكم شرعي بعد وفاة النبي ﷺ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت کے سر کے بال اس کے ستر میں داخل ہیں۔ اور تواتر عملی سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ عورتیں ہمیشہ سے ایک بڑی چادر لے کر گھر سے باہر نکلتی ہیں جس سے اپنے سارے جسم کو ڈھانپ لیتی ہیں لیکن غامدی صاحب عورت کے ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے ساتھ ساتھ سر کے بالوں کو بھی ستر شمار نہیں کرتے۔ ڈوپٹے سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"دوپٹا ہمارے ہاں مسلمانوں کی تہذیبی روایت ہے، اس بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ دوپٹے کو اس لحاظ سے پیش کرنا کہ یہ شرعی حکم ہے، اس کا کوئی جواز نہیں۔ البتہ اسے ایک تہذیبی شعار کے طور پر ضرور پیش کرنا چاہیے۔ اصل چیز سینہ ڈھانپنا اور زیب وزینت کی نمائش ہے۔ یہ مقصد کسی اور ذریعے سے حاصل ہو جائے تو کافی ہے۔ اس کے لیے دوپٹا ہی ضروری نہیں ہے۔" (ماہنامہ اشراق مئی ۲۰۰۲، ص ۴۷)

غامدی صاحب کس سادگی سے کہہ رہے ہیں کہ ڈوپٹے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم جاری نہیں کیا! سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُونَ۔ حالانکہ دوپٹا تو سنت کی اس تعریف سے بھی ثابت ہوتا ہے جو کہ غامدی صاحب نے اختراع کی ہے۔ عورت کے ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے بارے میں تو علماء کا جزوی اختلاف ہے کہ یہ عورت کے ستر میں داخل ہیں یا نہیں، لیکن عورت کے سر کے بالوں کے بارے میں امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ یہ عورت کا ستر ہیں اور عورت کے لیے ان کو چھپانا لازم ہے۔ علاوہ ازیں امت مسلمہ میں تواتر عملی سے یہ بات ثابت ہے کہ مسلمان عورتیں، صحابیات کے زمانے سے لے کر آج تک، جب بھی کسی کام سے گھر سے باہر نکلتی ہیں تو ایک بڑی چادر لے کر باہر نکلتی ہیں جس سے اپنے سارے جسم کو ڈھانپ لیتی ہیں۔ اس تواتر عملی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام غزالی لکھتے ہیں:

لسنا نقول ان وجه الرجل في حقها عورة كوجه المرأة بل هو كوجه الأمرد في حق الرجل فيحرم النظر عند خوف الفتنة فقط وان لم تكن فتنة فلا، اذ لم تزل الرجال على ممر الزمان، مكشوفي الوجوه والنساء يخرجن منتقبات فلو استووا لأمر الرجال بالتنقب أو منعن من الخروج

(احیاء العلوم، کتاب النکاح، باب آداب المعاشرہ)

"ہم یہ نہیں کہتے کہ مرد کا چہرہ عورت کے لیے ستر ہے جیسا کہ عورت کا چہرہ مرد کے لیے ستر ہے، بلکہ مرد کا چہرہ (عورت کے لیے) ایسا ہی ہے جیسا کہ بے ریش بچے کا چہرہ مرد کے لیے ہے۔ یعنی اگر فتنے کا اندیشہ ہوگا تو اس (مرد) کی طرف دیکھنا حرام ہوگا اور اگر فتنہ نہ ہو تو پھر اس (مرد) کی طرف دیکھنا جائز ہے۔ کیونکہ ہمیشہ سے یہ بات چلی آرہی ہے کہ مرد ہر زمانے میں کھلے چہرے کے ساتھ باہر نکلتے ہیں، جبکہ عورتیں نقاب پہن کر باہر نکلتی ہیں، اگر مرد بھی اس مسئلے میں عورتوں کے برابر ہوتے تو ان کو نقاب پہننے کا حکم دیا جاتا یا عورتوں کو باہر نکلنے سے منع کر دیا جاتا۔"

اسی تواتر عملی کو علامہ ابوحیان اندلسی نے 'البحر المحیط' میں ابن حجر عسقلانی نے 'فتح الباری' میں اور علامہ شوکانی نے 'نیل الاوطار' میں نقل کیا ہے۔ یہاں امام غزالی عورت کے بال تو چھوڑیے، نقاب یعنی چہرے کے پردے کے بارے میں، اپنے زمانے کے مشاہدے کے ساتھ ساتھ یہ بات کہہ رہے ہیں کہ وہ تواتر عملی سے ثابت ہے۔ پس ثابت ہوا کہ عورت کے بال بھی ستر میں داخل ہیں۔ اس پر امت مسلمہ کا اجماع ہے اور صحابیات کے زمانے سے لے کر آج کل کے بگڑے ہوئے اور بے عمل مسلمان معاشروں میں بھی یہ دوپٹا تواتر عملی سے ثابت ہے۔ تہذیب کا مسئلہ آج کل کا مسئلہ تو ہو سکتا ہے لیکن آج سے چودہ صدیاں پہلے مروجہ معنوں میں تہذیب کا کوئی نام بھی نہیں جانتا تھا۔ اس وقت میں صحابیات کا اپنے سر اور چہرے کو ڈھانپ کر رکھنا تہذیبی روایت نہیں تھی بلکہ وہ اس پر عمل اسے اللہ کا دین سمجھ کر کرتی تھیں نہ کہ تہذیبی روایت سمجھ کر!

غامدی صاحب کی سرپرستی میں شائع ہونے والے ایک انگلش رسالہ Renaissance میں ہم جنس پرستی کو فطرت انسانی قرار دیا جا رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرۃ:۱۲۰)

"اور (اے نبی ﷺ) یہود و نصاریٰ آپ سے اُس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک آپ ان کے دین کی پیروی نہ کریں۔"

"پیغمبروں کے دین میں موسیقی یا آلات موسیقی کو کبھی ممنوع نہیں قرار دیا گیا۔ بیش تر مقامات پر اللہ کی حمد و ثنا کے لیے موسیقی کے استعمال کا ذکر آیا ہے۔"

(ماہنامہ اشراق: ۱۹۹۶ء، ص ۶۱)

غامدی صاحب نے قرآن میں موجود لفظ 'تماثیل' کی بائبل کی آیات کی روشنی میں تفصیل کی ہے اور شیر، بیل اور ملائکہ کی تصاویر کو بھی کتاب مقدس کی روشنی میں صحیح قرار دیا ہے۔ ایک جگہ تورات کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت سلیمان علیہ السلام

کے محل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اور ان حاشیوں پر جو پڑوں کے درمیان تھے، شیر اور بیل اور کروبی (فرشتے) بنے ہوئے تھے۔"

غامدی صاحب کا حد رجم کا انکار

شادی شدہ شخص اگر زنا کا ارتکاب کرے تو صحیح احادیث کی رو سے اس کی سزا رجم ہے (یعنی پتھر مار مار کر مار دیا جائے) امت کے تمام اہل علم کا سلف سے خلف تک اس پر اتفاق ہے چنانچہ موسوعۃ الاجماع میں ہے:

ان المسلمین اجمعوا علی ان الزانی المحصن اذا زنی عامدا، عالما، مختارا، فحدہ الرجم حتی یموت، وقالت الخوارج و بعض المعتزلۃ بعدم الرجم (سعدی ابو جیب موسوعۃ الاجماع، ج ۱، ص ۳۴۴)

"مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ زانی محصن جب عمداً جانتے ہوئے اور اپنے اختیار سے زنا کا مرتکب ہو تو اس کی سزا رجم ہے یہاں تک کہ وہ مرجائے جبکہ خارجیوں اور بعض معتزلہ کا موقف رجم نہ کرنے کا ہے۔"

قاضی ابن رشد بدایۃ المجتہد میں لکھتے ہیں:

فاما الثیب الاحرار المحصنون فان المسلمین اجمعوا علی حدھم الرجم الا فرقۃ من اھل الأھواء فانھم رأوا ان حد کل زان الجلد (محمد بن احمد ابن رشد بدایۃ المجتہد، ج ۲، ص ۶۸۲)

"شادی شدہ آزاد محصن (زانی) کے بارے میں مسلمانوں کا اجماع ہے کہ ان کی حد رجم ہے، سوائے خواہش پرستوں کے ایک گروہ کے، کہ وہ ہر زانی کی سزا کوڑے تجویز کرتے ہیں۔"

اہل اسلام کا اجماعی اور متفقہ فیصلہ جاننے کے بعد

اہل اسلام کا اجماعی و متفقہ فیصلہ جاننے کے بعد اب یہ حیران کن امر بھی ملاحظہ کیجیے کہ خوارج، معتزلہ اور خواہش پرستوں کے نقطۂ نظر کو جناب جاوید احمد غامدی نے اختیار کر رکھا ہے اور اپنی کتاب 'برھان' میں اہل اسلام کے متفقہ موقف پر کڑی تنقید کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فقہائے اسلام نے قرآن و حدیث کا صحیح مدعا سمجھنے میں غلطی کی ہے اور مرتد کی سزا قتل قرار دے کر اسلام کے حدود و تعزیرات میں ایک ایسی سزا کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے جس کا وجود ہی شریعت اسلامیہ میں ثابت نہیں۔ گویا اس "صحیح مدعا" کا انکشاف پندرہویں صدی ہجری میں پہلی مرتبہ جناب جاوید احمد غامدی پر ہوا ہے۔

غامدی صاحب کا شادی شدہ زانی کے لئے رجم کی سزا کا انکار

اہل سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ رجم بھی زنا کی سزاؤں میں سے ایک سزا ہے۔ شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں بھی شریعت موسوی کی طرح زنا کی مختلف صورتوں کے اعتبار سے مختلف سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ شریعت محمدیہ میں زنا کی تین سزائیں ہیں: سو کوڑے، تغریب عام (ایک سال کی جلاوطنی) اور رجم کی سزا۔ واقعے کی نوعیت اور صورت حال کے اختلاف کی وجہ سے مختلف احوال میں مختلف سزائیں بیان کی گئی ہیں اور بعض اوقات زنا کے کسی واقعے میں جبر واکراہ، ظلم وزیادتی، قباحت اور شناعت کے بڑھ جانے کی وجہ سے دو سزاؤں کو جمع بھی کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ بعض احادیث میں زنا کی حد کے طور پر دو سزاؤں کو بھی جمع کیا گیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ فقہ الواقع کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور مختلف احوال میں واقع کی قباحت اور شناعت کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ اسی لیے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شریعت موسوی میں بھی زنا کی مختلف صورتوں کے لیے مختلف سزائیں بیان ہوئی ہیں جیسا کہ تورات کی ذیل میں بیان شدہ آیات سے پتا چلتا ہے۔ شریعت محمدیہ اور شریعت موسوی دونوں میں زنا کی ایک مخصوص صورت کی سزا رجم بیان ہوئی ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ اگر شادی شدہ مرد یا عورت زنا کرے تو ایسے زانی کی سزا رجم ہے لیکن غامدی صاحب نے شادی شدہ زانی مرد و عورت کے لیے رجم کی سزا کا انکار کیا ہے، کیونکہ ان کے خیال میں یہ قرآن سے ثابت نہیں ہے حالانکہ شادی شدہ زانی کے لیے یہ سزا قرآن سے بھی ثابت ہے، حدیث سے بھی ثابت ہے، فطرت صحیحہ سے بھی ثابت

ہے، عقل سلیم سے بھی ثابت اور کتاب مقدس سے بھی شادی شدہ زانی اور اس قسم کے زنا کے لیے رجم کی سزا ثابت ہوتی ہے اور یہ حکم اب بھی کتاب مقدس میں موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ مُرَّ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ بِيَهُوْدِيٍّ مُحَمَّمًا مَجْلُوْدًا فَدَعَاهُمْ فَقَالَ هٰكَذَا تَجِدُوْنَ حَدَّ الزَّانِيْ فِيْ كِتَابِكُمْ؟ قَالُوْا نَعَمْ، فَدَعَا رَجُلًا مِنْ عُلَمَائِهِمْ فَقَالَ اَنْشُدُکَ بِاللّٰهِ اَنْزَلَ التَّوْرَاةَ عَلٰى مُوْسٰى عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ اَهٰكَذَا تَجِدُوْنَ حَدَّ الزَّانِيْ فِيْ كِتَابِكُمْ؟ قَالَ لَا وَلَوْ لَا اَنَّکَ نَشَدْتَنِيْ بِهٰذَا لَمْ اُخْبِرْکَ، نَجِدُهُ الرَّجْمَ وَلٰكِنَّهُ كَثُرَ فِيْ اَشْرَافِنَا فَكُنَّا اِذَا اَخَذْنَا الشَّرِيْفَ تَرَكْنَاهُ وَاِذَا اَخَذْنَا الضَّعِيْفَ اَقَمْنَا عَلَيْهِ الْحَدَّ قُلْنَا تَعَالَوْا فَلْنَجْتَمِعْ عَلٰى شَيْءٍ نُقِيْمُهُ عَلَى الشَّرِيْفِ وَالْوَضِيْعِ فَجَعَلْنَا التَّحْمِيْمَ وَالْجَلْدَ مَكَانَ الرَّجْمِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَوَّلُ مَنْ اَحْيٰى اَمْرَکَ اِذْ اَمَاتُوْهُ فَاَمَرَ بِهٖ فَرُجِمَ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْکَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ اِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ يَقُوْلُ ائْتُوْا مُحَمَّدًا فَاِنْ اَمَرَكُمْ بِالتَّحْمِيْمِ وَالْجَلْدِ فَخُذُوْهُ وَاِنْ اَفْتَاكُمْ بِالرَّجْمِ فَاحْذَرُوْا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ فِي الْكُفَّارِ كُلِّهَا (مسلم کتاب الحدود)

”حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے

سے ایک یہودی کو گزارا گیا جو کو ئلے سے کالا کیا گیا اور کوڑے کھائے ہوئے تھا تو آپ ﷺ نے یہودیوں کو بلا بھیجا اور کہا کہ کیا تم اپنی کتاب میں زانی کی یہی سزا پاتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں۔ پھر آپ ﷺ نے ان کے عالموں میں سے ایک شخص کو بلایا اور اس سے کہا: میں تمہیں اس اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے تورات کو حضرت موسیٰ پر نازل کیا، کیا تم اس طرح زانی کی حد اپنی کتاب تورات میں پاتے ہو؟ اس یہودی عالم نے جواب دیا نہیں اور اگر آپ ﷺ مجھے یہ قسم نہ دیتے تو میں آپ کو اس کی خبر نہ دیتا، ہماری کتاب میں تو رجم کی سزا ہے لیکن جب زنا ہمارے عزت دار آدمیوں میں پھیل گیا تو جب ہم کسی امیر آدمی کو اس جرم میں پکڑ لیتے تو چھوڑ دیتے تھے اور جب کسی کمزور آدمی کو اس جرم میں پکڑ لیتے تو اس پر رجم کی حد جاری کر دیتے۔ تو اس وقت ہم نے کہا کہ ہم سب جمع ہو جائیں اور ایک سزا ایسی مقرر کر لیں جو کہ ہم امیر کو بھی دیں اور غریب کو بھی، تو ہم نے منہ کو کالا کرنا اور کوڑوں کی سزا رجم کے مقابلے میں مقرر کی۔ تو اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اے اللہ تعالیٰ! میں سب سے پہلے تیرے اس حکم کو زندہ کرتا ہوں جس کو انہوں نے ختم کر دیا تھا۔ تو آپ ﷺ نے اس یہودی کے بارے میں حکم دیا تو اس کو رجم کیا گیا تو اس موقع پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْکَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ سے لے کر اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ تک آیات نازل فرمائیں۔ یہود یہ کہتے تھے کہ تم محمد ﷺ کے پاس آؤ۔ اگر وہ تمہیں منہ کالا کرنے اور کوڑے مارنے کا حکم دیں تو ان کی بات مان لینا اور اگر وہ تمہیں زانی کے بارے میں رجم کا فتویٰ دیں تو قبول نہ کرنا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاریں:

وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ O.....

وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ O......

وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ O

یہ سب آیات کافروں کے بارے میں اتریں۔"

اس حدیث سے درج ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱) قرآن نے تورات کے حکم رجم کی وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کی آیات نازل کر کے تصدیق فرمائی ہے کہ تورات میں یہ حکم موجود ہے اور یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

۲) حکم رجم کو 'مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ ' کہہ کر قرآن نے خود بھی حکم رجم کا اثبات کیا۔ ہم غامدی صاحب سے یہی عرض کریں گے کہ ان کے بقول اگرچہ قرآن میں محض زانی کے لیے رجم کی سزا نہیں ہے لیکن اس حدیث کو سامنے رکھیں تو علم میں کم از کم اتنا ضرور اضافہ ہوتا ہے کہ موسیقی کے جواز کے اشارات سے زیادہ قوی اور یقینی اشارات قرآن میں رجم کی سزا کے لیے موجود ہیں۔ کاش کہ غامدی صاحب اپنے اصول ہی کا اطلاق کرتے ہوئے ان اشاراتِ قرآنی کو سامنے رکھتے اور ان کی روشنی میں تورات میں موجود زنا کی مختلف سزاؤں میں سے ایک سزا 'حد رجم' کا بھی اثبات کرتے۔ جس کتاب اللہ کے غامدی صاحب قائل ہیں اس میں اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں بھی اور آج بھی رجم کی سزا کو زنا کی حدود میں سے ایک حد کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تورات کی یہ آیات اس اعتبار سے محفوظ ہیں کہ زنا کی سزاؤں میں سے ایک سزا رجم بھی ہے لیکن غامدی صاحب رجم کو زنا کی سزا ماننے سے ہی

انکاری ہیں۔

زانی چاہے شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ

غامدی صاحب کے نزدیک زانی چاہے شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، دونوں صورتوں میں اس کی سزا سو کوڑے ہے، حالانکہ غامدی صاحب کا یہ موقف قرآن، کتاب مقدس، احادیث، اجماع امت، فطرت صحیحہ کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ عقل کے بھی خلاف ہے۔ کتنی سادہ سی بات ہے کہ اگر کوئی غیر شادی شدہ عورت کسی غیر شادی شدہ مرد کے ساتھ زنا کی مرتکب ہوتی ہے اللہ کی نافرمانی اور معصیت کی وجہ سے ان کی ایک سزا مقرر کی گئی ہے لیکن اگر کوئی شادی شدہ عورت یا مرد زنا کا مرتکب ہوتا ہے تو اب صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف تو اللہ کی نافرمانی ہوئی ہے اور دوسری طرف اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے جائز راستہ ہونے کے باوجود اللہ کی نافرمانی کی۔ تیسرا یہ کہ خاوند یا بیوی کے حقوق تلف ہوئے اور جذبات مجروح ہوئے۔ چوتھا خاندان کا شیرازہ بکھرنے کی صورتیں جمع ہوئیں۔ ان مفسدات کو پہلی صورت سے کہیں زیادہ بعد حاصل ہے اسی لیے دوسری صورت کی سزا مختلف رکھی گئی ہے۔

مسلمان عورت کا غیر مسلمان مرد سے شادی کرنا جائز ہے

اسلام کے قانون نکاح کی رو سے ایک مسلم مرد کے لیے اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ (المائدہ:۵)

"اور پاک دامن عورتیں ان میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی (تمہارے لیے حلال ہیں)۔"

ظاہر ہے کہ یہ اجازت صرف مسلم مردوں کے ساتھ خاص ہے، علاوہ ازیں مسلمان مردوں اور عورتوں کو مشرکین سے نکاح کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى یُؤْمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَتّٰى یُؤْمِنُوْا ؕ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ (البقرۃ:۲۲۱)

"تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا، جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی آزاد مشرک عورت سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو، اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے نہ کرو، جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام آزاد مشرک مرد سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔"

مندرجہ بالا دو آیات سے معلوم ہوا کہ:

۱) مسلمان مرد مسلمان عورت کے علاوہ اہل کتاب کی عورت سے بھی شادی کرسکتا ہے۔

۲) اس کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کی خاتون سے شادی کرنا اس کے لیے جائز نہیں۔

۳) مسلمان خواتین اہل کتاب کے مردوں سے شادی نہیں کرسکتیں، ورنہ صرف اہل کتاب خواتین کے حلال ہونے کا ذکر بے معنی ہوگا۔

۴) مسلمان مرد وزن کے لیے مشرکین سے نکاح کرنا ممنوع ہے۔

اب اس کے برعکس غامدی مکتب فکر کا نقطہ نظر ملاحظہ فرمایئے:

کسی خاتون نے سوال پوچھا کہ میں ایک مسلمان لڑکی ہوں اور ایک ہندو لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہوں، کیا مجھے اس کی اجازت ہے؟ اس کے جواب میں قرآن مجید کی مذکرہ بالا دو آیات ذکر کرنے کے بعد کہا گیا:

"ایک مسلمان لڑکی کے ایک غیر مسلم لڑکے سے شادی کرنے کا براہ راست ذکر سوائے مشرک مردوں کے قرآن مجید میں مثبت یا منفی، کسی پہلو سے موجود نہیں ہے۔ یعنی اسلامی شریعت میں یہ واضح طور پر بیان نہیں کیا گیا کہ ان کی شادی ہوسکتی ہے یا نہیں، لہٰذا اس معاملے میں مسلمان علماء کی آراء مختلف ہوسکتی ہیں۔ ہماری رائے میں غیر مسلم کے ساتھ شادی کو ممنوع یا حرام قرار نہیں دیا جاسکتا، البتہ قرآن مجید کی واضح ممانعت نہ ہونے کی بنا پر ایسی شادی غیر پسندیدہ قرار دی جاسکتی ہے۔ اس معاملے میں بہرحال آخری فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے کہ شادی کی جائے یا نہ۔" www.urdu.understandingislam.org

جواز ہی باقی نہیں رہتا جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا۔ ثانیاً حرمت کا واضح ذکر

.... سے جواز کیسے ثابت ہوگیا، اس کی کوئی دلیل ذکر نہیں کی گئی اور اہل علم کے ہاں مسلمہ قاعدہ ہے کہ الاصل فی البضعة التحریم (مناکحات میں اصل حرمت ہے) یعنی کسی سے تعلق زوجیت قائم کرنے کے لیے شریعت کی صریح اجازت کی ضرورت ہے، بصورت دیگر یہ جائز نہ ہوگا۔

ثالثاً یہ کہنا کہ اس مسئلے میں مسلمان علماء کی آراء مختلف ہوسکتی ہیں، محض ایک فلسفیانہ احتمال ہے جو کسی بھی معاملے میں اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس امر واقعہ میں اس مسئلے میں چودہ صدیوں سے آج تک مسلمان علماء کے ہاں کوئی اختلاف سامنے نہیں آیا کہ مسلمان عورت کی غیر مسلم سے شادی نہیں ہوسکتی۔ موسوعة الاجماع میں 'نکاح غیر المسلم للمسلمة' کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

"الاجماع علی تحریم نکاح الکافر للمرأة المسلمة"

''کافر کی مسلمان خاتون سے شادی کے حرام ہونے پر اجماع ہے۔''

عورت کا نکاح پڑھانا غامدی صاحب کے نزدیک جائز ہے

ابن رشد اپنی کتاب "بدایة المجتهد" میں لکھتے ہیں

واما النظر فی الصفات الموجبة للولایة والسالبة لها، فانهم اتفقوا علی ان من شرط الولایه لاسلام والبلوغ والذکوریة ......

(بدایة المجتهد، ج۲ص۹)

''ولایت کو واجب یا سلب کرنے والی صفات کے سلسلے میں علماء کا اتفاق ہے کہ ولایت کی صحت کے لیے تین شرطیں ہیں: (۱) مسلمان ہونا، (۲) بالغ ہونا اور (۳) مذکر ہونا۔''

اور "المغنی" میں ہے:

الذکوریة شرط للولایة فی قول الجمیع ...... (المغنی ج۶،ص۳۶۵)

''ولایت کے لیے مرد ہونا تمام علماء کے قول کے مطابق شرط ہے۔''

فقہا کی مندرجہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ عورت ولایت نکاح کی اہل نہیں اور یہ اہل علم کا متفقہ موقف ہے۔ یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ جو ولی نہ بن سکے وہ ولی کی وکالت (نیابت) بھی نہیں کرسکتا۔ امام ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

ومن لم تثبت له الولایة لم یصح توکیله لان وکیله نائب عنه وقائم مقامه. (ایضاً ج۶ص۳۶۷)

''جس کے لیے ولایت ثابت نہ ہو اسے وکیل بنانا صحیح نہیں کیونکہ ولی کا وکیل اس کا نائب اور قائم مقام ہوتا ہے۔''

جب عورت نہ ولی بن سکتی ہے اور نہ ولی کی وکالت کرسکتی ہے تو اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ نکاح نہیں پڑھا سکتی، کیونکہ نکاح میں دو اصل ...

ہے جو ولی یا اس کا وکیل ہی کر سکتا ہے اور عورت ان دونوں (ولایت اور وکالت) کی اہل نہیں۔

عورت کا نکاح پڑھانا غامدی صاحب کے نزدیک جائز ہے

چودہ صدیوں سے اہل اسلام اسی اجماعی و متفقہ رائے کے مطابق عمل کرتے رہے ہیں اور ان کی یہ روایت مسلمہ حیثیت رکھتی ہے کہ نکاح پڑھانے کا عمل مرد حضرات ہی سرانجام دیتے ہیں لیکن امت کے اس اجماعی موقف اور اجتماعی تعامل کے برعکس ''ارباب المورد'' کی رائے یہ ہے کہ عورت بھی نکاح پڑھانے کا استحقاق رکھتی ہے۔ چنانچہ جناب جاوید احمد غامدی سے سوال کیا گیا کہ کیا کوئی عورت نکاح پڑھا سکتی ہے؟ تو غامدی صاحب نے جواب دیا:

''جی ہاں بالکل پڑھا سکتی ہے......''

(www.urdu.understandingislam.org)

لیکن افسوس ہے کہ اس کی کوئی دلیل انہوں نے پیش نہیں فرمائی۔

ہمارے خیال میں جناب جاوید احمد غامدی کو اس کے بارے میں شرعی دلائل کے حوالے سے جواب دینا چاہیے تھا جسے انہوں نے نظر انداز کر دیا۔

ان کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں جملے ملتے ہیں کہ ''......اس مسئلے میں تمام فقہاء کی بالاتفاق یہی رائے ہے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ......'' اور ''ہمارے علماء کا نقطہ نظر یہی ہے مگر ہمارا موقف یہ ہے کہ......'' جبکہ درست رویہ یہ ہے کہ اہل علم کی متفقہ رائے کے بالمقابل کوئی نیا نقطہ نظر پیش کرنے کی بجائے ان کے دلائل پر غور و فکر کیا جائے اور گہرائی میں اتر کر اس کی معنویت تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ اس سے یقیناً صحیح نتیجے تک رسائی ہو جاتی ہے اور انسان گمراہی

مرد اور عورت کا اکٹھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنا جائز ہے

ادارہ ''المورد'' کے سکالرز کی شاذ و نادر تشریحات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کے نزدیک مرد اور عورت کا اکٹھے کھڑے ہو کر باجماعت نماز ادا کرنا جائز اور درست ہے۔ ایک سوال کے جواب میں ''ارباب المورد'' کا اس سلسلے میں نقطۂ نظر ان الفاظ میں سامنے آیا:

''مرد و عورت برابر کھڑے ہو کر باجماعت یا انفرادی، دونوں طرح سے نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اس سے دونوں کی نماز میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔''

(www.urdu.understandingislam.org)

اب یہاں دیکھیے کہ اس امر کی کوئی دلیل نہیں دی گئی کہ قرآن یا سنت میں اس کا جواز کہاں بیان ہوا ہے۔ اس کے برعکس احادیث رسول ﷺ کی روشنی میں اس حوالے سے جو رہنمائی ملتی ہے وہ یہ ہے کہ باجماعت نماز کی صورت میں عورتیں الگ صف میں کھڑی ہوں گی۔ چنانچہ عہد رسالت ﷺ میں مسجد نبوی ﷺ میں کی ترتیب کچھ اس طرح ہوتی تھی کہ پہلے مردوں کی صفیں ہوتی، اس کے بعد بچے صف بناتے اور بالکل آخر میں خواتین کھڑی ہوتی تھیں۔

علاوہ ازیں فقہائے کرام نے بھی صراحت کی ہے کہ عورت مرد کے ساتھ کھڑی ہونے کی بجائے اس کے پیچھے کھڑی ہوگی۔

فقہ اسلامی کی مشہور و معتبر کتاب ''المغنی'' کے مصنف امام ابو محمد عبداللہ بن احمد المعروف بابن القدامہ لکھتے ہیں:

وان صلت، خلف رجل قامت خلفه لقول النبي ﷺ أخروهن من

خَیْثُ اَخَّرَهُنَّ اللّٰہُ) وان کان معهما رجل قام عن یمین الامام والمرأة خلفهما، کما روی انس ان رسول اللہ ﷺ صلّی به وبامه او خالته فاقامنی عن یمینه واقام المرأة خلفنا. رواہ مسلم (ابن قدامہ، المغنی ج ۲، ص ۲۰۳)

''اگر عورت کسی مرد کی اقتدا میں نماز ادا کرے تو وہ اس کے پیچھے کھڑی ہوگی، کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: (تم خواتین کو پیچھے رکھو جیسا کہ اللہ نے انہیں مؤخر رکھا ہے) اور اگر ان دونوں (یعنی مرد وعورت) کے ساتھ کوئی اور آدمی بھی ہو تو وہ امام کے ساتھ کھڑا ہوگا اور خاتون ان دونوں کے پیچھے کھڑی ہوگی۔ جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے انہیں (انسؓ کو) اور ان کی والدہ یا خالہ کو نماز پڑھائی تو مجھے اپنی دائیں جانب کھڑا کیا اور عورت کو ہمارے پیچھے۔''

اس سے واضح ہوا کہ عورت مردوں کے ساتھ کھڑی نہیں ہوگی، بلکہ ان سے الگ صف میں نماز ادا کرے گی۔ ابن رشد لکھتے ہیں:

ولا خلاف فی ان المرأة الواحدة تصلی خلف الامام

(بدایۃ المجتہد ۱/۱۰۸)

''اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اکیلی عورت امام کے پیچھے کھڑی ہو کر نماز پڑھے گی۔''

''اہل اشراق'' کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ اکٹھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے دونوں کی نماز میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ احادیث میں صراحت ہے کہ مردوں کی بہترین صف پہلی اور ناپسندیدہ صف آخری ہے جبکہ عورتوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس کی توجیہ اہل علم نے یہی کی ہے کہ مردوں کی پہلی صف اور

عورتوں کی آخری صف میں چونکہ فاصلہ زیادہ اور باہمی قرب کم ہوتا ہے اس لیے یہ افضل ہیں، جبکہ عورتوں کی پہلی اور مردوں کی آخری صف میں قرب ہونے کی بنا پر یہ ناپسندیدہ ہیں۔ ہے کہ اس سے [illegible] ی ہوتی ہے جو ایک نقص ہے۔

معلوم ہوا کہ مذکورہ مسئلہ میں بھی امت ایک نقطے پر متفق ہے کہ عورت مردوں سے علیحدہ کھڑی ہو کر نماز پڑھے گی۔ لیکن ''اہل المورد'' کو یہاں بھی امت سے اتفاق نہیں اور وہ شوقِ اجتہاد میں راہِ اعتزال پر گامزن ہیں۔

غامدی صاحب کے نزدیک سؤر کے جسمانی اجزاء کی تجارت جائز ہے

''ان علاقوں میں جہاں سؤر کا گوشت بطور خوراک استعمال نہیں کیا جاتا، وہاں اس کی کھال اور دوسرے جسمانی اجزاء کو تجارت اور دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنا ممنوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔'' (ماہنامہ اشراق اکتوبر ۱۹۹۸، ص ۷۹)

''اہل اشراق'' نے سؤر کی کھال وغیرہ کی تجارت کے ناجائز ہونے کی اصل علت اس امر کو قرار دیا ہے کہ اس سے سؤر کے گوشت کھانے کے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں، لہٰذا جہاں یہ مواقع نہ ہوں وہاں حرمت باقی نہیں رہتی۔ جبکہ پوری امت کے علماء وفقہاء کے نزدیک یہ علی الاطلاق حرام ہے اور اس خود ساختہ علت کا انہوں نے کوئی اعتبار نہیں کیا، کیونکہ شریعت میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

یہ بات بہرحال بالکل واضح ہے کہ علی الاطلاق سؤر کے اجزاء کی خرید و فروخت کسی بھی فقیہ یا عالم کے نزدیک جائز نہیں اور اہل اشراق اس مسئلہ میں بھی پوری امت کے بالمقابل ایک شاذ رائے اپنائے ہوئے ہیں۔ ہمارے لیے یہ امر بھی ناقابل فہم ہے کہ اس قدر نجس اور غلیظ شے کو (جس کے ہر جزو کی نجاست پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے) نجانے کیوں تجارت کے لیے جائز قرار دیا جا رہا ہے جسے ایک سلیم الفطرت انسان کسی طور پر بھی گوارا نہیں کر سکتا۔

شریعت نے جانوروں کے حلال اور حرام ہونے کو اپنا موضوع نہیں بنایا

غامدی صاحب اپنی کتاب ''میزان'' کی فصل (اصول و مبادی) میں لکھتے ہیں: ''اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو جانور پیدا کیے ہیں ان میں سے بعض کھانے کے ہیں اور بعض کھانے کے نہیں ہیں۔ یہ دوسری قسم کے جانور اگر کھائے جائیں تو اس کا اثر چونکہ انسان کے تزکیہ پر پڑتا ہے اس لیے ان سے اباء اس کی فطرت میں داخل ہے۔ انسان کی یہ فطرت بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کر لیتا ہے کہ اسے کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں کھانا چاہیے۔ اسے معلوم ہے کہ شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گدھ، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ گھوڑے، گدھے دستر خوان کی لذت کے لیے نہیں، سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان جانوروں کے بول و براز کی نجاست سے بھی وہ پوری طرح واقف ہے۔ اس میں شبہ نہیں اس کی یہ فطرت کبھی کبھی مسخ ہو جاتی ہے، لیکن دنیا میں انسانوں کی عادات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد اس معاملے میں عموماً غلطی نہیں کرتی۔ چنانچہ خدا کی شریعت نے بھی ان جانوروں کی حلت و حرمت کو اپنا موضوع نہیں بنایا، بلکہ انسان کو اس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے۔ اس باب میں شریعت کا موضوع صرف وہ جانور اور ان کے متعلقات ہیں جن کی حلت و حرمت کا فیصلہ تنہا عقل و فطرت کی رہنمائی میں کر لینا ممکن نہ تھا۔ سؤر انعام کی قسم بہائم میں سے ہے، لیکن درندوں کی طرح گوشت بھی کھاتا ہے، پھر اسے کیا کھانے کا جانور سمجھا جائے یا نہ کھانے کا؟ وہ جانور جنہیں ہم ذبح کر کے کھاتے ہیں اگر تزکیے کے بغیر مر جائیں تو ان کا کیا حکم ہونا چاہیے؟ انہیں جانوروں کا خون کیا ان کے بول و براز کی طرح نجس ہے یا

اسے حلال وطیب قرار دیا جائے گا؟ یہ اگر خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کر دیے جائیں تو کیا پھر بھی حلال ہی رہیں گے؟ ان سوالوں کا کوئی واضح اور قطعی جواب چونکہ انسان کے لیے دینا مشکل تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے اسے بتایا کہ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے پاک نہیں ہیں اور انسان کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جانوروں کی حلت وحرمت میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں۔ چنانچہ قرآن نے بعد جگہ "قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْمَآ اُوْحِیَ" اور بعض جگہ "اِنَّمَا" کے الفاظ میں پورے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی حلت و حرمت کے باب میں صرف یہی چار چیزیں حرام قرار دی ہیں۔ بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ نبی ﷺ نے کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ یہ اسی فطرت کا بیان ہے جس کا علم انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ ہم اگر چاہیں تو ممنوعات کی اس فہرست میں بہت سی دوسری چیزیں بھی اس علم کی روشنی میں شامل کر سکتے ہیں۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اسے بیان فطرت کے بجائے بیان شریعت سمجھا، درآں حالیکہ شریعت کی ان حرمتوں سے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں، اس کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر حدیث سے قرآن کے نسخ یا اس کے مدعا میں تبدیلی کا کوئی مسئلہ پیدا کیا جائے۔"

(میزان، جاوید احمد غامدی، ص ۳۷ تا ۳۹)

قرآن ان کی کوئی جامع مانع فہرست پیش نہیں کرتا

اسی طرح غامدی صاحب ایک اور جگہ اپنی کتاب میزان (اصول و مبادی) میں لکھتے ہیں:

"قرآن کی دعوت اس کے پیش نظر جن مقدمات سے شروع ہوتی ہے وہ یہ ہیں:

۱- دین فطرت کے حقائق، ۲- سنت ابراہیمی، ۳- نبیوں کے صحائف۔

پہلی چیز کو وہ اپنی اصطلاح میں معروف ومنکر سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور وہ جس سے فطرت اباء کرتی اور انہیں برا سمجھتی ہے۔ قرآن ان کی کوئی جامع مانع فہرست پیش نہیں کرتا بلکہ اس حقیقت کو مان کر کہ انسان ابتدا ہی سے معروف ومنکر، دونوں کو پورے شعور کے ساتھ بالکل الگ الگ پہچانتا ہے، اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ معروف کو اپنائے اور منکر کو چھوڑ دے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبہ:۷۱)

"اور وہ مومن مرد اور مومن عورتیں یہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ یہ باہم دگر معروف کی نصیحت کرتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔"

اس معاملے میں اگر کسی جگہ اختلاف ہو تو زمانہ رسالت کے اہل عرب کا رجحان فیصلہ کن ہوگا۔" (ماہنامہ اشراق مارچ ۲۰۰۴، ص ۱۱)

المورد کے ریسرچ سکالر جناب منظور الحسن غامدی صاحب کے مآخذ دین کے بارے میں لکھتے ہیں:

''قرآن مجید دین کی آخرت کتاب ہے۔ دین کی ابتدا اس کتاب سے نہیں، بلکہ ان بنیادی حقائق سے ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے روز اول سے انسانی فطرت میں ودیعت کر رکھے ہیں۔ اس کے بعد وہ شرعی احکام ہیں جو وقتاً فوقتاً انبیاء کی سنت کی حیثیت سے جاری ہوئے اور بالآخر سنت ابراہیمی کے عنوان سے بالکل متعین ہوگئے۔ پھر تورات، زبور اور انجیل کی سورت میں آسمانی کتابیں ہیں جن میں ضرورت کے لحاظ سے شریعت اور حکمت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نبی ﷺ کی بعثت ہوئی ہے اور قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن دین کی پہلی نہیں، بلکہ آخری کتاب ہے اور دین کے مصادر قرآن کے علاوہ فطرت کے حقائق، سنت ابراہیمی کی روایت اور قدیم صحائف بھی ہیں۔ اس موضوع پر مفصل بحث استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی تالیف ''میزان'' کے صفحہ ۴۷ پر ''دین کی آخری کتاب'' کے زیر عنوان ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔''

(میزان جاوید احمد غامدی، ص ۴۷ تا ۴۸)

اپنے اس اصول کے تحت غامدی صاحب نے فنون لطیفہ (موسیقی، مصوری اور مجسمہ سازی وغیرہ) کو جائز قرار دیا۔ اسی طرح انہوں نے اپنے اسی اصول کو استعمال کرتے ہوئے تمام سمندری جانوروں کو حلال قرار دیا۔

غامدی صاحب کے نزدیک تصویر سازی جائز ہے

شریعت اسلامیہ کی تعلیمات انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ فطرت سلیمہ دراصل دین کے مطابق ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ ..... (مشکوۃ، ج ۱، ص ۳۳)

''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔''

ان تصوير صورة الحيوان حرام شديد التحريم وهو من الكبائر

(موسوعہ الاجماع، ج ۲ ص ۶۶۷، ۶۶۸)

''بلاشبہ جاندار کی تصویر بنانا سخت حرام ہے اور یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ یہ تصویر خواہ کپڑے میں ہو، یا دینار پر ہو، یا دیوار پر ہو، یا اس کے علاوہ کہیں ہو (ہر صورت میں حرام ہے) یہی اہل علم کا قول ہے۔''

اسی کتاب کے اگلے صفحہ پر ''حكم صنع التماثيل'' (مجسمہ سازی کا حکم) کے زیر عنوان درج ذیل الفاظ بھی موجود ہیں:

ان الاجماع على ان الصور ان كانت ذات اجسام حرام يجب تغييرها، سواء كانت مما يمتهن ام لا.

''اس بات پر اجماع ہے کہ اگر تصاویر جسم رکھتی ہوں تو وہ حرام ہیں جن کو تبدیل کرنا واجب ہے، چاہے انہیں حقیر سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے۔''

امت کے اس اجماعی نقطۂ نظر سے آگاہی کے بعد ہم قارئین کرام کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ ادارۂ علم و تحقیق ''المورد'' کے سکالرز یہاں بھی اجماع کے انکاری ہیں اور تصاویر جیسی حرام و ناجائز چیز کو مباح اور جائز قرار دے رہے ہیں۔ ''المورد'' کے ریسرچ سکالر جناب محمد رفیع مفتی اپنی کتاب ''تصویر کا مسئلہ'' میں ''تصویر کے حوالے سے دین کا موقف'' کی سرخی جما کر لکھتے ہیں:

''تصویر کے بارے میں قرآن مجید کی آیات اور احادیث نبوی ﷺ کی رہنمائی سے یہ بات تو کھل کر سامنے آگئی ہے کہ مذہب کا تصویر و تمثال پر اعتراض صرف اور صرف کسی دینی اور اخلاقی خرابی ہی کی بنا پر ہے، ورنہ اسے ان چیزوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہنا۔'' (تصویر کا مسئلہ، ص ۳۰)

مزید لکھتے ہیں:

''لیکن فی نفسہٖ تصاویر کے بارے میں کسی اعتراض کی کیونکر گنجائش ہو سکتی ہے جبکہ خدا اور اس کے رسول نے انھیں جائز رکھا ہو؟''

غامدی صاحب کے اصول فطرت کی غلطی

غامدی صاحب کا مذکورہ بالا اصول فطرت غلط ہے اور اس کی غلطی کی درج ذیل وجوہات ہیں:

کیا شریعت نے صرف چار چیزوں کو حرام قرار دیا ہے؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ اب شریعت نے کھانے کے جانوروں میں صرف چار چیزوں سؤر، خون، مردار اور خدا کے علاوہ کسی اور نام پر ذبح کیے گئے جانور کو حرام قرار دیا ہے۔ غامدی صاحب میزان (اصول و مبادی) میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے اسے بتایا کہ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے پاک نہیں ہیں اور انسان کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جانوروں کی حلت و حرمت میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں۔ چنانچہ قرآن نے بعد جگہ ''قُلْ لَّا أَجِدُ فِيْمَا أُوْحِيَ'' اور بعض جگہ ''إِنَّمَا'' کے الفاظ میں پورے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی حلت و حرمت کے باب میں صرف یہی چار چیزیں حرام قرار دی ہیں۔''

غامدی صاحب نے اپنے ایک غلط اصول (کہ حدیث کے ذریعے قرآن پر اضافہ یا اس کا نسخ نہیں ہو سکتا) کو سیدھا کرنے کے لیے یہ ساطہ فلسفہ گھڑا۔ غامدی صاحب کے نزدیک گدھا حرام ہے لیکن اس لیے نہیں کہ شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے، بلکہ ان کی فطرت انھیں یہ بتلاتی ہے کہ گدھا سواری کرنے کا جانور ہے نہ کہ کھانے کا، اس لیے یہ فطری محرمات میں سے ہے۔ غامدی صاحب میزان (اصول و مبادی) میں لکھتے ہیں:

''وہ (یعنی انسان) جانتا ہے کہ گھوڑے، گدھے دسترخوان کی لذت کے لیے نہیں، سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔''

غامدی صاحب کی فطرت کا اونٹ کے بارے میں کیا خیال ہے

غامدی صاحب کی فطرت کا اونٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ بھی تو سواری کا جانور ہے۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عرب میں سواری کے لیے سب سے زیادہ استعمال ہونے والا جانور اونٹ تھا، اس کے بعد گھوڑا، گدھے کا استعمال سواری کے لیے تو استعمال ہونے والا جانور اونٹ تھا، اس کے بعد گھوڑا، جبکہ گدھے کا استعمال سواری کے لیے تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ غامدی صاحب یہ کہتے ہیں کہ اونٹ کو قرآن نے حلال قرار دیا ہے تو پھر غامدی صاحب کے اس بیان کا کیا مطلب ہے کہ:

''جانوروں کی حلت وحرمت میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں۔''

غامدی صاحب کے نزدیک شراب پینا شرعی طور پر حرام نہیں

فطری محرمات کا اصول وضع کر کے غامدی صاحب نے دین میں ایک نئے فتنے کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اور یہ فتنہ کس طرح آگے بڑھ رہا ہے اس کا اندازہ المورد کے ایک ریسرچ سکالر امیر عبدالباسط صاحب کے شراب سے متعلقہ ایک سوال کے جواب سے ہوتا ہے:

''اپنے پچھلے جواب میں ہم نے (شراب کے لیے) ناپسندیدہ کا لفظ حرمت کے مقابلے میں اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ اس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ شراب پینا شرعی حرمتوں میں سے نہیں ہے بلکہ وہ تو اس سے بھی زیادہ بنیادی یعنی فطری حرمتوں میں سے ہے۔ آپ (سائل) نے فرمایا کہ ہماری رائے نصوص شریعہ کے خلاف ہے۔ اگر آپ قرآن کی کوئی ایسی آیت پیش کر دیں جس میں اللہ تعالیٰ نے شراب کو واضح لفظوں میں حرام قرار دیا ہے تو ہمیں اپنی رائے سے رجوع کرنے میں ہرگز کوئی تامل نہیں ہوگا۔''

(www.urdu.understandingislam.org)

یہ فتاویٰ جات غامدی صاحب کی نگرانی میں قائم شدہ المورد کی سرکاری ویب سائٹ (www.urdu.understandingislam.org) پر جاری کیے جارہے ہیں۔ کیا شراب کی حرمت کے بارے میں قرآن کے چار مختلف انداز سے تاکیدی اور صریح بیانات رِجْسٌ اور مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ، اور فَاجْتَنِبُوْهُ، اور فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ، سے بھی اس کی شرعی حرمت ثابت نہیں ہوتی؟ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۔

دین کے مصادر قرآن کے علاوہ سنت ابراہیمی اور قدیم صحائف بھی ہیں

المورد کے ریسرچ سکالر جناب منظور الحسن غامدی صاحب کے مآخذ دین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"قرآن مجید دین کی آخرت کتاب ہے۔ دین کی ابتدا اس کتاب سے نہیں، بلکہ ان بنیادی حقائق سے ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے روز اول سے انسانی فطرت میں ودیعت کر رکھے ہیں۔ اس کے بعد وہ شرعی احکام ہیں جو وقتاً فوقتاً انبیاء کی سنت کی حیثیت سے جاری ہوئے اور بالآخر سنت ابراہیمی کے عنوان سے بالکل متعین ہو گئے۔ پھر تورات، زبور اور انجیل کی صورت میں آسمانی کتابیں ہیں جن میں ضرورت کے لحاظ سے شریعت اور حکمت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نبی ﷺ کی بعثت ہوئی ہے اور قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن دین کی پہلی نہیں، بلکہ آخری کتاب ہے اور دین کے مصادر قرآن کے علاوہ فطرت کے حقائق، سنت ابراہیمی کی روایت اور قدیم صحائف بھی ہیں۔ اس موضوع پر مفصل بحث استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی تالیف "میزان" کے صفحہ ۴۷ پر "دین کی آخری کتاب" کے زیر عنوان ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔"

(میزان جاوید احمد غامدی، ص ۴۷ تا ۴۸)

اپنے اس اصول کے تحت غامدی صاحب نے فنون لطیفہ (موسیقی، مصوری اور مجسمہ سازی وغیرہ) کو جائز قرار دیا۔ اسی طرح انہوں نے اپنے اسی اصول کو استعمال کرتے ہوئے تمام سمندری جانوروں کو حلال قرار دیا۔

غامدی صاحب کا اصول مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی نظر میں

سجدہ تعظیمی سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے امین احسن اصلاحی صاحب کی تحریر میں سے چند اقتباسات ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں:

"سوال یہ ہے کہ قرآن میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں یا بعض جگہ پچھلی شریعتوں کے جو جو حوالے آ گئے ہیں، کیا وہ مجرد اتنی بات سے کہ وہ قرآن میں مذکور ہیں، اس امت کے لیے شریعت کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں، یا اس امت کے لیے ان شریعت بننے کے لیے کچھ اور شرطیں بھی ہیں؟ میرا نقطہ نظر اس طرح کے تمام واقعات اور حوالوں سے متعلق یہ ہے کہ یہ مجرد قرآن میں مذکور ہو جانے کی وجہ سے امت محمدیہ کے لیے شریعت بن گئے قرآن میں حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ جب ان کو ان کے بھائی نے قتل کرنے کی دھمکی دی تو انہوں نے کہا کہ میں تو تم پر قتل کے ارادے سے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا، خواہ تم مجھے قتل ہی کر ڈالو۔ میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے اپنی بیٹی کا نکاح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محض اس خدمت کے معاوضے میں کر دیا کہ وہ ایک خاص مدت تک ان کی بکریاں چرائیں۔ حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ ان کی قوم کے غنڈوں نے جب ان کے مہمان کی فضیحت کرنی چاہی تو انہوں نے ان کو مخاطب کر کے کہا: اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو میری لڑکیوں کے ساتھ کرو، خدارا میرے مہمانوں کے بارے میں مجھے رسوا نہ کرو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں ہیں کہ ایک مرتبہ فوج کی پریڈ کے موقع پر ان کی نماز عصر قضا ہو گئی تو انہوں

نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر گھوڑوں ہی کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ سورۂ کہف میں ایک نیک بندے کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے اس بناء پر ایک بچے کو قتل کر دیا تھا کہ انہیں یہ علم ہو گیا تھا کہ وہ بڑا ہو کر اپنے ماں باپ کا نافرمان ہوگا اور ایک کشتی میں اس بنا پر سوراخ کر دیا کہ انہیں اندیشہ ہوا کہ اس دیار کا بادشاہ کہیں اس کشتی کو قبضے میں نہ کر لے۔ یہ اور اس طرح کے جو واقعات قرآن میں بیان ہوئے ہیں اور بطریق مذمت نہیں بیان ہوئے بلکہ بطریق مدح بیان ہوئے ہیں، یہ اس امت کے لیے قانون اور شریعت بن جائیں گے؟ اور ایک شخص کے لیے یہ بات جائز ہو جائے گی کہ اگر وہ اپنے کشفی علم سے کسی بچے کے بارے میں یہ معلوم کر لے کہ یہ نافرمان اٹھے گا تو اسے قتل کر ڈالے یا کوئی شخص اس پر حملہ آور ہو تو اپنے آپ کو بے چون و چرا اس کے حوالے کر دے؟...... ان ضمنی طور پر بیان شدہ واقعات سے اگر کوئی تعلیم نکلتی ہے تو وہ اس امت کے لیے اس صورت میں ہدایت اور شریعت کا درجہ اختیار کر سکتی ہے جب کتاب وسنت کی دوسری تصریحات سے بھی اس بات کی تائید ہو جائے کہ اس تعلیم کو اس امت کے اندر بھی باقی رکھنا شارع کو مطلوب ہے یا کم از کم یہ کہ کوئی بات اس کے خلاف نہ پائی جائے۔ لیکن اگر دوسری تصریحات اس کے خلاف ہوں تو اس کے صاف معنی یہ ہوں گے کہ اس امت میں اس تعلیم کو باقی رکھنا شارع کو مطلوب نہیں ہے۔ اگر اس قسم کی کوئی تصریح خود قرآن میں ہو تو وہ تصریح اس اشارہ پر مقدم ہوگی...... اور اگر یہ تصریح کے بجائے حدیث میں ہو تو بھی اس کو تقدم حاصل ہوگا...... جو کچھ موجود ہے اس کی حیثیت محض ایک واقعہ کی ہے جو پچھلی امتوں میں سے کسی امت میں یا سابق انبیاء میں سے کسی نبی کی زندگی میں پیش آیا۔ سوال یہ ہے کہ اس امت میں یہ

بات بعینہ اس شکل میں مطلوب ہے یا نہیں، تو اس کی وضاحت قرآن بھی کر سکتا ہے اور حدیث بھی کر سکتی ہے۔ قرآن کے کسی واضح حکم کو منسوخ کرنے کے لیے تو بلاشبہ حدیث ناکافی ہے لیکن پچھلی امتوں یا سابق انبیاء میں سے کسی کی تعلیم کو یا کسی روایت کو منسوخ کرنے کے لیے تو حدیث بالکل کافی ہے۔ بے شمار معاملات ہیں جن میں ہم جانتے ہیں کہ سابق انبیاء کی تعلیم کچھ اور تھی اور ہمارے نبی نے ہمیں اس کی جگہ کوئی اور ہدایت فرمائی اور ہم بے چون و چرا اس کو تسلیم کرتے ہیں، یہ عذر نہیں پیش کرتے کہ کسی سابق نبی کی تعلیم کو حدیث کس طرح منسوخ کر سکتی ہے۔" (ماہنامہ اشراق، نومبر ۱۹۸۹ء، ص ۳۶ تا ۳۸)

امین احسن اصلاحی صاحب کی درج بالا عبارت سے درج ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱) کتاب مقدس کی وہ تعلیمات جو قرآن میں اشارتاً، اجمالاً یا تفصیلاً بیان ہوئی ہیں، اس وقت تک ہمارے لیے دلیل نہیں بن سکتیں جب تک کہ خود قرآن یا حدیث سے ان تعلیمات کا اثبات نہ ہو۔ گویا کہ اصل دلیل قرآن وسنت ہے نہ کہ سابقہ شرائع، جبکہ غامدی صاحب سابقہ شرائع کو مستقل طور پر مآخذ دین میں سے شمار کرتے ہیں اور ان سے بھی مسائل کا اثبات کرتے ہیں۔

۲) قرآن کے علاوہ اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث بھی کتب سابقہ کی تعلیمات کی منسوخی کے لیے کافی ہیں۔ یعنی قرآن کی کسی آیت کی تفسیر یا اس کے علاوہ کسی مسئلے میں اگر کتاب مقدس اور احادیث میں اختلاف ہو جائے تو حجت احادیث ہوں گی جبکہ غامدی صاحب قرآن کی کسی آیت کی تفسیر میں احادیث کے بالمقابل کتاب مقدس کی آیات کو ترجیح دیتے ہیں، جیسا کہ بہت سارے معاملات میں

کی آراء سے بھی ظاہر ہے۔

۳) بہت سارے احکامات جو پچھلی شریعتوں میں جائز تھے، ہمارے لیے ان پر عمل کرنا یا ان سے اپنے عمل پر دلیل پکڑنا جائز نہیں جبکہ غامدی صاحب اس کے قائل نہیں ہیں کہ ایک فعل کسی شریعت میں جائز رہا ہو اور بعد میں اسے کسی دوسری شریعت میں شارع کی طرف سے ناجائز قرار دے دیا گیا ہو۔

غامدی صاحب کا اصول میزان کی نظر میں

غامدی صاحب نے جس طرح سے موسیقی یا جوج ماجوج اور تصویر وغیرہ کے مسئلے میں کتاب مقدس سے استدلال کیا ہے وہ خود ان کے اپنے اس اصول کے سبب ہے جو انہوں نے اپنی کتاب 'میزان' میں بیان کیا ہے۔ غامدی صاحب 'میزان' میں ایک جگہ تدبر قرآن کے اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سوم یہ کہ الہامی لٹریچر کے خاص اسالیب، یہود و نصاریٰ کی تاریخ، انبیائے بنی اسرائیل کی سرگزشتوں اور اس طرح کے دوسرے موضوعات سے متعلق قرآن کے اسالیب و اشارات کو سمجھنے اور اس کے اجمال کی تفصیل کے لیے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے۔'' (میزان، جاوید احمد غامدی ص ۵۲)

اس عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک قدیم صحائف کو یہود و نصاریٰ کے اخبار واقعات اور قصص و تاریخ سے متعلقہ قرآنی آیات کو سمجھنے کے لیے ماخذ بنایا جائے گا نہ کہ احکام و عقائد کے لیے۔ یہ نہایت موزوں موقع تھا کہ غامدی صاحب اس مسئلے پر اصولی بحث کرتے ہوئے اپنی اس عبارت میں احکام اور عقائد کا بھی تذکرہ کر دیتے، لیکن ان کا یہاں پر احکام و عقائد کا تذکرہ نہ کرنا اور کہیں اور جا کر احکام اور عقائد سے متعلقہ مسائل کے لیے

قدیم صحائف کو بنیاد بنانا ذہن میں کچھ سوالات ضرور پیدا کرتا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ موسیقی اور تصویر کا تعلق احکام سے ہے اور یاجوج ماجوج کا تعیین عقیدے کا مسئلہ ہے۔ عقیدے اور احکام کے بارے میں غامدی صاحب کے ہاں ایک انتہا تو یہ ہے کہ خبر واحد سے تو کسی عقیدے کو ثابت نہیں کیا جا سکتا لیکن دوسری طرف تحریف شدہ کتاب مقدس سے وہ کس سہولت و آسانی سے احکام و عقائد کا اثبات کر رہے ہیں، یہ بالکل ظاہر و باہر ہے۔ غامدی صاحب کے نزدیک حدیث سے کوئی نیا حکم یا عقیدہ تو ثابت نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ حدیث قرآن میں موجود کسی حکم یا عقیدے کی تفہیم و تبیین میں دلیل بن سکتی ہے جبکہ یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ غامدی صاحب کتاب مقدس سے ایک نئے حکم (موسیقی کا جواز) کو ثابت کر رہے ہیں، کیونکہ بقول ان کے قرآن کے الفاظ میں اس مسئلہ کی حلت و حرمت کے بارے میں کوئی یقینی حکم نہیں ہے۔ گویا کہ غامدی صاحب کے نزدیک کتاب مقدس صرف قرآنی آیات و احکام کی تفہیم و تبیین ہی نہیں کرتی بلکہ اس سے نئے احکام کا اثبات بھی کیا جا سکتا ہے۔ فیا للعجب

غامدی صاحب کے نظریات کا رد قرآن وسنت کی روشنی میں

اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت کے اندر امت محمدیہ نہ تو سابقہ شرائع کی متعبد ہے اور نہ ہی سابقہ امم کی کتابیں ہمارے لیے ماخذ دین کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس دعوے کے درج ذیل دلائل ہیں۔

پہلا ثبوت

اللہ کے رسول ﷺ نے جب حضرت معاذؓ کو یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا تو فرمایا: كَيْفَ تَقْضِيْ إِذَا عَرَضَ لَكَ قَضَاءٌ قَالَ: أَقْضِيْ بِكِتَابِ اللّٰهِ، قَالَ: فَإِنْ لَّمْ تَجِدْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ، قَالَ، فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ، قَالَ: فَإِنْ لَّمْ تَجِدْ فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ، قَالَ: أَجْتَهِدُ رَأْيِيْ.

(سنن ابوداؤد کتاب الاقضیہ)

''اگر تمہیں کوئی مسئلہ درپیش ہوگا تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ تو حضرت معاذؓ نے جواب دیا میں قرآن سے فیصلہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تمہیں قرآن میں نہ ملے؟'' تو حضرت معاذؓ نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر وہ مسئلہ نہ قرآن میں ملے اور نہ سنت رسول میں؟'' تو حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔''

اس روایت میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے پچھلے انبیاء اور ان کی تعلیمات کا بالکل بھی تذکرہ نہیں کیا۔ اگر سابقہ کتب سماویہ بھی ماخذ دین میں سے ہوتیں تو اللہ کے رسول ﷺ ان کو ان کتب کی طرف بھی رجوع کا حکم دیتے۔ لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے اس قول کو صحیح قرار دیتے ہوئے ان کے لیے دعا کی۔

دوسرا ثبوت

قاضی شریح نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ان کو ایک خط لکھا جس میں قضاء کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے رہنمائی حاصل چاہی تو حضرت عمر رضی اللہ نے ان کو جواباً یہ خط لکھا:

أَنِ اقْضِ بِمَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ، فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ، فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَلَا فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ فَاقْضِ بِمَا قَضٰى بِهِ الصَّالِحُوْنَ، فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَلَا فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَلَمْ يَقْضِ بِهِ الصَّالِحُوْنَ فَإِنْ شِئْتَ فَتَقَدَّمْ وَإِنْ شِئْتَ فَتَأَخَّرْ وَلَا أَرَى التَّأَخُّرَ إِلَّا خَيْرٌ لَّكَ وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ (سنن نسائی، کتاب آداب القضاۃ)

''تم اللہ کی کتاب قرآن کے ساتھ (لوگوں کے درمیان) فیصلہ کرو اگر کتاب اللہ میں وہ مسئلہ موجود نہ ہو تو اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کے ساتھ فیصلہ کرو، اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں بھی نہ ہو اور سنت رسول ﷺ میں بھی نہ ہو تو نیک لوگوں کے فیصلوں کو سامنے رکھو، پس اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں بھی نہ ہو اور سنت رسول اللہ ﷺ میں بھی نہ ہو اور نیک لوگوں نے بھی اس کے بارے میں کوئی رائے نہ دی ہو تو اب اگر تم چاہو تو آگے بڑھو (یعنی خود اجتہاد کرو) لیکن میرے خیال میں تمہارا رکا رہنا تمہارے حق میں بہتر ہے تمہارے اوپر اللہ کی سلامتی ہو''۔

تیسرا ثبوت

اگر پچھلی شریعتیں بھی ماخذ دین میں سے ہوتیں تو ان کا سیکھنا فرض کفایہ ہوتا اور اللہ کے رسول ﷺ خود بھی تورات وانجیل کی تعلیم حاصل کرتے اور صحابہ کرام رضی

اللہ عنہ کو بھی کتاب مقدس کی تعلیم دیتے۔ جبکہ ہمارے علم میں ہے کہ نہ تو اللہ کے رسول ﷺ نے خود سابقہ کتب کا مطالعہ کیا اور نہ صحابہ نے ان کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی حالانکہ آپ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہ کے پاس عبداللہ بن سلام، کعب الاحبار اور وہب بن منبہ رضی اللہ تعالیٰ کی صورت میں اس کے مواقع بھی موجود تھے۔

چوتھا ثبوت

اس بات پر علماء امت کا اجماع ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے آکر پچھلی شریعتوں کو منسوخ کر دیا۔ اگر استثناء ہے بھی تو محض عقائد، اخلاقیات اور چند بنیادی مخصوص احکامات کا جن کو ہماری شریعت نے بھی برقرار رکھا ہے۔ اس لیے پچھلی شریعتوں سے عمومی طور پر دلیل پکڑنا صحیح نہیں ہے۔

پانچواں ثبوت

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي: نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِي وَأُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً

(بخاری کتاب التیمم)

"مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں کہ مجھ سے پہلے وہ کسی نبی کو نہ دی گئیں، پہلی بات یہ ہے کہ ایک مہینے کی مسافت تک دشمنوں پر میرا رعب ڈال دیا گیا۔ دوسری بات یہ کہ میرے لیے مال غنیمت کو حلال کر دیا گیا۔ چوتھی بات یہ کہ مجھے

مقام شفاعت عطا کیا گیا اور پانچویں بات یہ کہ مجھ سے پہلے انبیاء کو ایک خاص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور مجھے تمام نوع انسانی کا نبی بنا کر بھیجا گیا۔"

اللہ کے رسول ﷺ کے یہ الفاظ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً اس مسئلے میں قطعی حجت ہیں کہ سابقہ شرائع مخصوص اقوام کے لیے تھیں جبکہ وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً کے الفاظ سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ آپ ﷺ کی ہی شریعت وہ اکیلی شریعت ہے جو قیامت تک کے انسانوں کے لیے رہنمائی اور ہدایت کی صلاحیت رکھتی ہے۔

چھٹا ثبوت

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے:

كَانَ أَهْلُ الْكِتَابِ يَقْرَءُونَ التَّوْرَاةَ بِالْعِبْرَانِيَّةِ وَيُفَسِّرُونَهَا بِالْعَرَبِيَّةِ لِأَهْلِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ((لَا تُصَدِّقُوا أَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوهُمْ وَقُولُوا ﴿آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا ...... الآية﴾

(بخاری کتاب التفسیر)

"اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے عربی زبان میں اس کی تفسیر کرتے تھے تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: نہ تو اہل کتاب کی تصدیق کرو اور نہ ان کی تکذیب کرو اور یہ بات کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا......"

اللہ کے رسول ﷺ کی طرف تو وحی آتی تھی اور آپ ﷺ وحی کی روشنی میں اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بتا سکتے تھے کہ تورات کی یہ آیات محفوظ ہیں یا نہیں اور تورات کی محفوظ آیات سے استدلال بھی کر سکتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے نہ تو بذات خود تورات کی آیات کی تصدیق کی اور نہ ہی صحابہ رضی اللہ عنہ کو اس کی اجازت دی۔

ساتواں ثبوت

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً وَحَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (سنن ترمذی کتاب العلم)

''میری طرف سے پہنچاؤ چاہے وہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو اور بنی اسرائیل سے روایت کر لیا کرو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور جس نے جان بوجھ کر میرے اوپر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔''

'ولا حرج' کے الفاظ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل سے روایت کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ مباح ہے۔ ایک ایسی چیز کہ جس سے نقل کرنے کی رخصت دی گئی ہو وہ ہمارے لیے شریعت کیسے ہو سکتی ہے؟ جو چیز شریعت ہے اس سے استدلال واجب ہے جیسے کہ قرآن وسنت ہیں جبکہ سابقہ کتب سے رہنمائی کو واجب قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس کی رخصت دی گئی ہے اور یہ رخصت بھی راجح قول کے مطابق صرف واقعات کی حد تک ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اجازت دینے کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی جاری فرما دی کہ اہل کتاب کی باتیں سن لینے میں اور بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن ان کی باتوں کی تصدیق یا تکذیب نہ کرو۔ اس حدیث کے مطابق بنی اسرائیل سے متعلقہ قرآنی اخبار و قصص کی تکمیل کے لیے کتاب مقدس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن ان واقعات میں بھی بہت کچھ جھوٹ کی آمیزش ہو چکی ہے جس کی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ نے اہل کتاب سے نقل کرنے کی اجازت تو دے دی لیکن اس کی تصدیق و تکذیب

سے روک دیا۔

آٹھواں ثبوت

حضرت عبید اللہ بن عبد اللہؒ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

كَيْفَ تَسْأَلُونَ أَهْلَ الْكِتَابِ عَنْ شَيْءٍ وَكِتَابُكُمُ الَّذِي أُنْزِلَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ أَحْدَثُ تَقْرَءُونَهُ مَحْضًا لَمْ يُشَبْ وَقَدْ حَدَّثَكُمْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ بَدَّلُوا كِتَابَ اللَّهِ وَغَيَّرُوهُ وَكَتَبُوا بِأَيْدِيهِمُ الْكِتَابَ وَقَالُوا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أَلَا يَنْهَاكُمْ مَا جَاءَكُمْ مِنَ الْعِلْمِ عَنْ مَسْأَلَتِهِمْ لَا وَاللَّهِ مَا رَأَيْنَا مِنْهُمْ رَجُلًا يَسْأَلُكُمْ عَنِ الَّذِي أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ

(بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

''کیسے تم اہل کتاب سے کسی مسئلے کے بارے میں پوچھتے ہو حالانکہ تمہاری کتاب جو کہ اللہ کے رسول ﷺ پر نازل کی گئی، زیادہ نئی ہے؟ تم اس کو خالص حالت میں پڑھتے ہو اور اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں کی گئی جبکہ اہل کتاب نے اللہ کی کتاب کو بدل ڈالا ہے اور اس کو تبدیل کر دیا ہے اور اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھی ہے اور اس کے بعد یہ دعویٰ کیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ وہ اس کے بدلے میں کچھ قیمت حاصل کر سکیں۔ خبردار! جو علم (قرآن وسنت) تمہارے پاس آیا ہے وہ تمہیں اہل کتاب سے سوال کرنے سے منع کرتا ہے۔ نہیں، اللہ کی قسم ہم نے اہل کتاب میں سے کسی آدمی کو نہیں دیکھا کہ جو تم سے اس (قرآن وسنت) کے بارے میں سوال کرے جو کہ تم پر نازل کیا گیا ہے۔''

اگر کوئی اس حدیث کی تشریح میں یہ بات کہے کہ اہل کتاب سے کوئی مسئلہ

دریافت کرنے سے منع کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ سابقہ کتب محفوظ نہیں، اگر وہ محفوظ ثابت ہو جائیں تو ان سے رہنمائی لی جا سکتی ہے، تو ہمارے نزدیک یہ استدلال غلط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے سابقہ کتب کی تعلیمات کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ وہ محفوظ ہیں یا نہیں، چنداں مشکل نہ تھا۔ صحابہ کرام اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ سکتے تھے جبکہ اللہ کے رسول ﷺ کو وحی کے ذریعے معلوم ہو سکتا تھا کہ یہ تعلیم محفوظ ہے اور اس میں تحریف ہو چکی ہے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور آپ ﷺ کا سابقہ کتب کی تعلیمات سے عدم تعرض اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سابقہ کتب سے استدلال نہ کرنے کا جو حکم ہے اس کی اصل علت شریعت محمدیہ کا کامل و اکمل ہونا ہے جو کہ انتہائی درجے اتمام اور اکمال کی وجہ سے سابقہ شرائع کی کسی طور بھی محتاج نہیں ہے۔

نواں ثبوت

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا تَسْأَلُوا اَهْلَ الْكِتَابِ عَنْ شَيْءٍ فَاِنَّهُمْ لَنْ يَهْدُوكُمْ وَقَدْ ضَلُّوا فَاِنَّكُمْ اِمَّا اَنْ تُصَدِّقُوا بِبَاطِلٍ اَوْ تُكَذِّبُوا بِحَقٍّ لَوْ كَانَ مُوسٰى حَيًّا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ مَا حَلَّ لَهُ اِلَّا اَنْ يَتَّبِعَنِيْ (مسند احمد، ۱۴۱۰۴)

"اہل کتاب سے کچھ بھی نہ پوچھو۔ بے شک وہ تمہاری رہنمائی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ خود گمراہ ہو چکے ہیں۔ ان سے مسئلہ پوچھ کر یا تو تم کسی باطل چیز کی تصدیق کر بیٹھو گے یا کسی حق بات کو جھٹلاؤ گے۔ (یاد رکھو) اگر موسیٰ (علیہ السلام) بھی تمہارے درمیان موجود ہوتے تو ان کے لیے بھی سوائے میری اتباع کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔"

"عَنْ شَيْءٍ" میں ہر چیز داخل ہے۔ یعنی سابقہ شرائع کسی مسئلے میں بھی رہنمائی کے قابل نہیں ہیں چاہے وہ مسئلہ عقائد سے متعلق ہو یا احکام سے یا اخبار و قصص سے، کسی حد تک قرآن وسنت کے سیاق وسباق کی تعیین کے لیے اسرائیلی اخبار وقصص کے نقل کرنے کی جو رخصت دی گئی ہے اس میں بھی اصل مطلوب ان کتب میں بیان شدہ واقعات سے رہنمائی حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اصل مقصد قرآن وسنت میں وارد شدہ واقعات کے صحیح مفہوم تک حاصل کرنا ہے۔

دسواں ثبوت

آج یہ بات تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے زمانے میں صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے نہ کہ اس وقت کی پوری دنیا کی طرف مبعوث تھے۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں مصر وفلسطین کے علاوہ بھی دنیا تھی جہاں لوگ آباد تھے۔ ان کے لیے شریعت کون سی تھی؟ ان کی طرف کس نبی کو بھیجا گیا تھا؟ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے وقت میں ساری دنیا کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے؟ یقیناً اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث اور تاریخ اس چیز کی نفی کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ساری دنیا کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت اپنے زمانے میں موجود تمام انسانوں کے لیے حجت نہ تھی تو صدیوں بعد آنے والی امت محمدیہ کے لیے کیسے دلیل بن سکتی ہے؟

گیارھواں ثبوت

ایک حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ حِيْنَ اَتَاهُ عُمَرُ فَقَالَ اِنَّا نَسْمَعُ اَحَادِيْثَ مِنْ

يَهُوْدَ تُعْجِبُنَا اَفَتَرٰى اَنْ نَكْتُبَ بَعْضَهَا؟ فَقَالَ اَمُتَهَوِّكُوْنَ اَنْتُمْ كَمَا تَهَوَّكَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى؟ لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً وَلَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهٗ اِلَّا اِتِّبَاعِيْ (مشکوٰۃ، ۱۷۷)

"حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ آپ ﷺ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے تو انہوں نے آپ سے کہا کہ ہم یہود سے بہت ساری ایسی باتیں سنتے ہیں جو کہ ہمیں اچھی لگتی ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے، اگر ہم ان میں سے کچھ کو لکھ لیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم بھی اہل یہود کی طرح ہلاک ہونا چاہتے ہو! میں تمہارے پاس ایسی واضح اور روشن آیات لے کر آیا ہوں کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ہوتے تو ان کے لیے بھی میری اتباع کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔"

ایک اور طویل روایت کے الفاظ یہ ہیں:

وَلَوْ كَانَ حَيًّا وَّ اَدْرَكَ نُبُوَّتِيْ لَاتَّبَعَنِيْ

"اور اگر حضرت موسیٰ زندہ ہوتے اور میری نبوت کو پالیتے تو لازماً میری اتباع کرتے۔"

بعض روایات میں الفاظ ہیں:

لَوْ كَانَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى حَيَّيْنِ لَمَا وَسِعَهُمَا اِلَّا اتِّبَاعِيْ

"اگر موسیٰ اور عیسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی میری اتباع کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔"

ان احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پچھلی ساری شریعتیں منسوخ ہیں اور اگر وہ محفوظ ثابت ہو بھی جائیں تو پھر بھی ان پر عمل نہ ہوگا، جب ان انبیاء کے بارے میں فرمادیا گیا جن پر یہ کتابیں نازل ہوئیں کہ وہ بھی اگر آپ کے زمانے کو

پالیں تو انہیں بھی اپنی کتابوں کی بجائے آپ ﷺ کی اتباع کرنی ہوگی، حالانکہ اس صورت حال میں تو تورات وانجیل بعینہ اپنی اصل شکل میں محفوظ ثابت ہوجاتی ہیں۔ حضرات موسیٰ اور عیسیٰ اگر زندہ ہوتے تو ان کے لیے تورات وانجیل ایسے ہی محفوظ ہوتی جیسے ہمارے لیے قرآن، کیونکہ ان سے زیادہ تورات وانجیل کو کون جانتا ہوگا لیکن اس کے باوجود ان کے بارے میں کہا گیا کہ وہ آپ کے ایک امتی ہی کی حیثیت سے اس امت میں زندگی گزارتے۔ اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ جب اس دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے تو آپ ﷺ کے امتی ہی کی حیثیت سے آئیں گے اور آپ ﷺ ہی کی لائی گئی شریعت کے پیرو ہوں گے نہ کہ تورات وانجیل کے، مسلم کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِيْ يُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ قَالَ فَيَنْزِلُ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ فَيَقُوْلُ اَمِيْرُهُمْ فَقَالَ صَلِّ لَنَا فَيَقُوْلُ لَا اِنَّ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ اُمَرَاءُ تَكْرِمَةَ اللّٰهِ هٰذِهِ الْاُمَّةَ (مشکوٰۃ)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں سے ایک گروہ قیامت تک حق کے لیے لڑتا رہے گا اور (اپنے دشمنوں پر) قیامت (کے قریب) تک غالب رہے گا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم کا نزول ہو۔ تو ان کا امیر حضرت عیسیٰ سے کہے گا: آئیں! ہمارے لیے امامت کرائیں تو حضرت عیسیٰ انکار کریں گے اور فرمائیں گے کہ تم میں بعض بعض کا امیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عزت بخشی ہے (کہ ان کا امیر انہی میں سے ہو)۔"

بارھواں ثبوت

علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں آیہ مبارکہ:

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ (آل عمران:۸۱)

کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان فقہائے صحابہ کے نزدیک اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ:

"اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام انبیاء سے یہ وعدہ لیا تھا کہ اگر ان میں سے کسی ایک کی ظاہری زندگی میں آپ مبعوث ہوجائیں تو وہ آپ ﷺ پر لازماً ایمان لے آئیں گے اور آپ ﷺ کی مدد کریں گے اور اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو یہ بھی حکم دیا کہ وہ اپنی امت سے بھی یہ پختہ وعدہ لیں کہ اگر ان کی موجودگی میں آپ کا ظہور ہوجائے تو وہ آپ ﷺ پر ایمان لے آئیں گے۔"

انبیاء سے آپ ﷺ پر ایمان لانے کا جو مطالبہ کیا گیا ہے اس سے یہ بات خوب اچھی طرح واضح ہو رہی ہے کہ آپ کی آمد کے بعد کسی نبی کو بھی اپنی شریعت پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی چہ جائیکہ کسی امتی کو آپ کی بعثت کے بعد یہ اجازت دی جائے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ آخری نبی کی لائی ہوئی شریعت کو اتنا جامع اور مکمل ہونا تھا کہ وہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے رہنمائی بن سکے جبکہ باقی انبیاء کو ان کے خاص دور علاقے اور قوم کی مناسبت سے شریعتیں دی گئی تھیں۔

پاکستان شریعت کونسل (کینسل) کے سربراہ اور ماہنامہ الشریعہ کے سرپرست مولانا زاہد الراشدی صاحب کے بارہ میں "وفاق المدارس" ملتان کا تبصرہ

ہمارے سامنے یہ ماہنامہ "الشریعہ" کا نومبر، دسمبر 2008ء کا شمارہ ہے۔ جو "الشریعہ اکیڈمی" گوجرانوالہ سے مولانا زاہد الراشدی صاحب کی زیر سرپرستی برسوں سے شائع ہو رہا ہے اور ہمارے پاس ماہنامہ "وفاق المدارس" میں تبصرے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اس کے رئیس تحریر مولانا زاہد الراشدی صاحب اور مدیران کے بیٹے حافظ عمار خان ناصر صاحب ہیں۔ مولانا زاہد الراشدی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایک سیال قلم بخشا ہے۔ وہ اپنی بات انتہائی سلیس اور روانی سے شیریں اسلوب میں پڑھنے والے کے دل کے اندر اتارتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی نسبت بھی بہت بلند ہے اور امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر مدظلہم کے صاحبزادے اور پاکستان میں گوجرانوالہ کی مشہور دینی درس گاہ جامعہ نصرۃ العلوم کے شیخ الحدیث ہیں۔ مولانا زاہد الراشدی رسالے کے اجراء کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے اس ترجمان کی ابتداء اس عزم کے ساتھ ہوئی تھی کہ دور حاضر کے مسائل اور چیلنجز کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی تعلیمات واحکام کو جدید اسلوب اور تقاضوں کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ عالم اسلام کے علمی ودینی حلقوں کے درمیان رابطہ ومفاہمت کے فروغ کی راہ ہموار کی جائے گی۔ اسلام دشمن لابیوں اور حلقوں کے تعاقب اور نشان دہی کا فریضہ انجام دیا جائے گا اور دینی حلقوں میں فکری بیداری کے ذریعے سے جدید دور کے علمی وفکری چیلنجز کا

ادراک واحساس اجاگر کیا جائے گا۔ ان مقاصد کی طرف ہم کس حد تک پیش رفت کر پائے ہیں۔ اس کے بارہ میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ الشریعہ ص۲ جنوری 2006ء

آج جب کہ ہم یہ تبصرہ لکھ رہے ہیں۔ الشریعہ کی اشاعت کو تقریباً بیس سال مکمل ہونے کو ہیں۔ الشریعہ کی فائلیں دیکھ کر ہمیں انتہائی دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے۔ ''مولانا زاہد راشدی صاحب اس پلیٹ فارم پر اپنے اکابر کی راہ مستقیم سے الگ ہو رہے ہیں''۔ ہمیں معلوم نہیں کہ مولانا زاہد الراشدی صاحب کے مقاصد وہی ہیں جو اوپر ذکر کئے گئے ہیں اور وہ واقعتاً انہی مقاصد کے لئے اتنی تگ و دو کر رہے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ الشریعہ کے ذریعے ذہنی اضطراب وانتشار کے علاوہ بظاہر علمی ودینی حلقوں میں اسی طرح کی کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ جہاں تک اسلامی تعلیمات کو جدید اسلوب اور تقاضوں کے مطابق پیش کرنا ہے اسلام دشمن لابیوں اور حلقوں کا تعاقب کرنا ہے اور دور جدید کے علمی وفکری چیلنجز کا ادراک واحساس اجاگر کرنا ہے تو دینی حلقے پہلے بھی یہ فریضہ انجام دے رہے تھے اب بھی دے رہے ہیں اور ان شاء اللہ مستقبل میں بھی دیتے رہیں گے۔

لیکن الشریعہ کا طرز اسلوب اور حالات وواقعات بتاتے ہیں کہ الشریعہ اکیڈمی کی صورت میں مولانا زاہد الراشدی صاحب جس علمی وفکری ماحول اور معاشرے کی تشکیل دینا چاہتے ہیں اس کی ایک مثال تحقیق کے نام پر اہل اسلام کے مسلمات سے تجاوز اور قدیم وجدید کے درمیان تطبیق وآہنگی کے نام پر اسلامی احکامات کی حقیقی شکل وصورت کو مسخ کرنے کی صورت میں ان کے بیٹے اور ان کی سرپرستی میں شائع ہونے والے ماہنامہ ''الشریعہ'' کے مدیر محمد عمار خان ناصر کی صورت

میں سامنے آئی ہے۔ یہ مولانا کی بیس سالہ کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ جس کو وہ مختلف افکار ونظریات کے حامل مسلمان اہل علم کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا بتاتے ہیں۔ مولانا بظاہر معروف تجدد پسند **جاوید احمد غامدی** سے علمی وفکری اختلاف کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس کی علمی وفکری کاوشوں کا ثمرہ اور مرکز محور بتاتا ہے کہ وہ غامدی افکار ونظریات کے امین اور اس کی اشاعت وترویج کے لئے اپنی صلاحیتیں پورے طور پر بروئے کار لائے ہوئے ہیں۔

مولانا زاہد الراشدی صاحب کے بیٹے اور ماہنامہ الشریعہ کے مدیر حافظ عمار خان ناصر جاوید احمد غامدی کے شاگرد وخوشہ چین ہیں اور وہ آزاد خیالی میں انہی کے طرز فکر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی تالیفی کاوشیں اور الشریعہ کی فائلیں ہماری اس بات کی شاہد ہیں اور ماہنامہ ''الشریعہ'' کا اجراء بھی اسی طرز فکر کو پروان چڑھانے کے لئے کیا گیا۔ خود مولانا زاہد الراشدی صاحب کا طرز عمل بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں مولانا کے بیٹے جناب عمار خان ناصر نے ''حدود وتعزیرات'' پر کتاب کی تالیف کی جس میں انہوں نے پیغمبر اسلام کے بلند مرتبہ صحابہ رضی اللہ عنہم پر کیچڑ بھی اچھالا اور کئی طے شدہ اجماعی مسائل سے انحراف بھی کیا ہے۔ اس مختصر تبصرے میں ان کے چند خرافات بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

1: **رجم کی شرعی حیثیت سے انکار:** عمر احمد عثمانی، امین احسن اصلاحی اور جاوید احمد غامدی کی پیروی میں انہوں نے محصن کی حد رجم کا انکار کیا ہے۔

''سورۃ نساء کی آیت نمبر 15 میں زنا کے جن عادی مجرموں کے لئے عبوری

سزا بیان کی گئی ہے ان کا جرم چونکہ زنا کے عام مجرموں کے مقابلے میں کئی گناہ زیادہ سنگین تھا اور ان میں سے بالخصوص یاری آشنائی کا تعلق رکھنے والے بدکار جوڑے اس عرصے میں توبہ واصلاح کا موقع دیئے جانے کے باوجود اپنی روش سے باز نہیں آئے تھے۔ اس لئے عام مجرموں کے برخلاف زنا کے یہ عادی مجرم بدیہی طور پر اضافی سزاؤں کے بھی مستحق تھے۔ چنانچہ ان کے بارے میں نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالی کی طرف سے یہ ہدایت کی گئی کہ سو کوڑوں کے ساتھ ساتھ ان کی جلاوطنی اور رجم کی اضافی سزائیں بھی نافذ کی جائیں۔ صدر اول سے اہل علم کی غالب ترین اکثریت کا نقطہ نظر یہ رہا ہے کہ عبادہ بن صامت کی روایت اور اس کے علاوہ جلاوطنی اور رجم کی سزا سے متعلق دیگر روایات زنا کے عام مجرموں ہی سے متعلق ہیں اور متعدد روایات سے بظاہر اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ اس رائے کے مطابق ان اضافی سزاؤں کو ہر طرح کے زانی پر قابل اطلاق مانا جائے تو یہ بات بظاہر قرآن مجید کے مدعا سے متجاوز قرار پاتی ہے۔''
(حدود وتعزیرات ص ۱۳۷ تا ۱۳۸)

2: **مرتد کی شرعی سزا کا انکار:** ارتداد کی سزائے موت پر امت کا اجماع ہے جب کہ انہوں نے دور حاضر میں ارتداد پر سزائے موت نافذ نہ کرنے کے ریاستی قوانین کو بالکل درست قرار دیا ہے۔

''دور جدید کی بیشتر مسلم ریاستوں میں ارتداد پر سزائے موت نافذ کرنے کا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ جو ہماری رائے میں حکم کی علت کی رو سے بالکل درست ہے۔''

(''حدود وتعزیرات'' ارتداد کی سزا ص ۲۲۸)

3: **لعان دور نبوی کی عملی مجبوری تھی:** قرآن مجید کے واضح حکم ''لعان'' کے مقابلے میں دور حاضر کی طبی تحقیقات کو کافی قرار دیا ہے۔

''قدیم دور میں بچے کے نسب کی تحقیق کا کوئی یقینی ذریعہ موجود نہیں تھا۔ چنانچہ لعان کے سوا اس معاملے کا کوئی حل ممکن نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیوی پر الزام لگانے کی صورت میں لعان کا طریقہ اختیار کر کے بچے کے نسب کو عورت کے شوہر سے منقطع کرنا بجائے خود مقصود نہیں، بلکہ عملی مجبوری کا نتیجہ تھا۔ اب اگر دور جدید میں طبی ذرائع کی مدد سے بچے کے نسب کی تحقیق یقینی طور پر ممکن ہے اور اپنے نسب کا تحفظ بجائے خود بچے کا ایک جائز حق بھی ہے تو بیوی کے کہنے پر یا بڑا ہونے کے بعد خود بچے کے مطالبے پر ان ذرائع سے مدد لینا اور اگر ان کی رو سے بچے کا نسب اپنے باپ سے ثابت قرار پائے تو اسے قانونی لحاظ سے اس کا جائز بیٹا تسلیم کرنا ہر لحاظ سے شریعت کے منشاء کے مطابق ہوگا''۔ (حدود وتعزیرات، ص ۲۲۸ تا ۲۲۹)

4: **عورت کی نصف دیت کا انکار:** عورت کی نصف دیت جیسے اجماعی مسئلے کے بھی وہ منکر ہیں لکھتے ہیں۔

''اصول فقہ کے ایک طالب علم کو بحث میں فقہائے احناف کے اصولی منہج میں بے قاعدگیوں (Inconsistency) کے اس سوال سے بھی سابقہ پیش آتا ہے۔ جس کی مثالیں احناف آرا میں جابجا پائی جاتی ہیں۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ احناف مسلم اور غیر مسلم کے باہمی قصاص اور غیر مسلم کی دیت کے معاملے میں تو قرآن مجید کے الفاظ کے عموم کی روشنی میں صحابہ کے فتاوی اور فیصلوں اور قانونی تعامل کو نظر انداز

کرتے یا ان کی توجیہ وتاویل کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔لیکن عورت کی دیت کے معاملے میں قرآن مجید کے عموم، صحیح وصریح احادیث اور عقل وقیاس کو نظر انداز کرتے ہوئے نہ صرف عورت کی دیت کو مرد سے نصف قرار دیتے ہیں۔ بلکہ جراحات میں مرد اور عورت کے مابین سرے سے قصاص ہی کے قائل نہیں۔

(حدود وتعزیرات،ص105,106)

5: صحابہ رضی اللہ عنہم معیار حق نہیں: اس میں مزید حدود سے تجاوز کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے کہ صحابہ کا عورت کی نصف دیت پر اجماع کرنا زمانہ جاہلیت کے معاشرتی تصورات اور رسم ورواج سے متاثر ہونے کی بناء پر تھا اور اس سلسلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوششیں صحابہ میں بارآور نہ ہوسکیں۔لہذا اس کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے آئیڈیل اور معیار ہونے پر انہوں نے سوالیہ نشان کھڑا کیا ہے۔

''اگرچہ عورت کے بارے میں جاہلی تصورات اور رسوم کی اصلاح کردی گئی تاہم بعض تصورات جن میں عورت کی جان کی حرمت اور قدر وقیمت کے حوالے سے زیر بحث تصور بھی شامل ہے۔کی اصلاح کی کوشش نتیجہ خیز اور موثر نہ ہوسکیں اور صحابہ و تابعین کو معروضی معاشرتی تناظر میں ایسے قوانین تجویز کرنا پڑے جن میں انہی سابقہ تصورات کی عملی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہو''۔ (حدود وتعزیرات،ص105)

6: آگے لکھتے ہیں: ''منصوص احکام کے ساتھ ساتھ مستنبط اور اجتہادی قوانین واحکام کی وہ عملی صورت جو تاریخ اسلام کے صدر اول میں اختیار کی گئی مذہبی زاویہ نگاہ سے اس کے آئیڈیل اور معیار ہونے کی حیثیت پر سوالیہ نشان کھڑا ہوجاتا ہے''۔

(حدود وتعزیرات،ص105)

7: اجماع کا انکار: چنانچہ اجماع کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل واضح ہے کہ علمی وفقہی تعبیرات کے دائرے میں ''اجماع'' کا تصور ایک علمی ''افسانہ'' ہے جس کا حقیقت کے ساتھ دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے''۔ (مفتی عبدالواحد کی تنقیدات کا ایک جائزہ،ص13)

8: ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ جب کسی صاحب علم کو سابقہ آراء وتوجیہات پر اطمینان نہ ہو تو اسے اس بات کا پابند کرنا کہ وہ ''اجماع'' ہی کے دائرے میں اپنے آپ کو ضرور مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔ ایک لایعنی بات ہے''۔ (مفتی عبدالواحد کی تنقیدات کا ایک جائزہ،ص21)

9: صحابہ رضی اللہ عنہم پر طعن وتشنیع: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن وتشنیع کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ممکن ہے مولانا محترم کا یہ مفروضہ منافقین کے بارے میں درست ہو۔لیکن جہاں تک مخلص اور خداترس اہل ایمان کا تعلق ہے تو مستند روایات کی رو سے وہ ایسا (زنا بالجبر) کرنے کی پوری پوری جرات رکھتے تھے''۔

(مفتی عبدالواحد کی تنقیدات کا ایک جائزہ،ص42)

10: ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

''اس معاشرے میں آپ کے تربیت یافتہ اور بلند کردار صحابہ کے علاوہ منافقین وتربیت سے محروم کمزور مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو مختلف اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں میں مبتلا تھی۔اس طرح کے گروہوں میں نہ صرف پیشہ

ورانہ بدکاری اور یار آشنائی کے تعلقات کی مثالیں پائی جاتی تھیں بلکہ اپنی مملوکہ لونڈیوں کو زنا پر مجبور کر کے ان کے ذریعے سے کسب معاش کا سلسلہ بھی جاری وساری تھا"۔

(تنقیدات کا ایک جائزہ ص43)

یہ اور اس طرح کے دیگر انحرافات کے باوجود "حدود وتعزیرات" نامی اس کتاب پر مولانا زاہد الراشدی صاحب نے دیباچہ لکھا ہے اور اپنے بیٹے کے اس کاوش کو سراہا ہے۔ ان کا دیباچہ "الشریعہ" میں بھی شائع ہوا ہے۔ اگر اس میں غور وفکر کی جائے تو اس کی پوری عبارت ڈانواں ڈول نظر آتی ہے۔ ان کی تعبیرات میں پیچ وخم ہے اس میں حفظ ما تقدم کے لئے سابقے اور لاحقے کے طور پر "شرطیہ جملوں" اور "استثنائی تعبیرات" کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس غلط روش کی روک تھام کے بجائے آخر میں مولانا نے اہل علم سے اپیل کی ہے کہ وہ ان مسائل میں بحث ومباحثہ کو آگے بڑھائیں۔ حالانکہ یہ مسلمہ اجماعی مسائل ہیں اجتہادی نہیں ہیں اس کے باوجود مولانا لکھتے ہیں۔

11: **عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ** نے اس علمی کاوش کا سلسلہ آگے بڑھایا ہے۔ اور زیادہ وسیع تناظر میں حدود وتعزیرات اور ان کے متعلقہ امور ومسائل پر بحث کی ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے ہر پہلو سے اتفاق کیا جائے۔ البتہ اس کاوش کا یہ حق ضرور بنتا ہے کہ اہل علم اس کا سنجیدگی سے جائزہ لیں۔ بحث ومباحثہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کے مثبت ومنفی پہلوؤں پر اظہار خیال کریں اور جہاں کوئی غلطی محسوس کریں۔ اسے انسانی فطرت کا تقاضا تصور کرتے ہوئے علمی مواخذہ کا حق استعمال کریں تاکہ صحیح نتیجے پر پہنچنے میں ان کی معاونت بھی شامل ہو جائے"۔

(حدود وتعزیرات ص13)

اسی "دیباچہ" میں مولانا زاہد الراشدی صاحب اپنے بیٹے کی تحریفات کو جواز فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

12: "**آج کے نوجوان اہل علم** جو اسلام کے چودہ سو سالہ ماضی اور جدید گلوبلائزیشن کے ثقافتی ماحول کے سنگم پر کھڑے ہیں۔ وہ نہ ماضی سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں اور نہ مستقبل کے ناگزیر تقاضوں سے آنکھیں بند کرنے کے لئے تیار ہیں۔ وہ اس کوشش میں ہیں کہ ماضی کے علمی ورثہ کے ساتھ وابستگی برقرار رکھتے ہوئے قدیم وجدید میں تطبیق کی کوئی قابل قبول صورت نکل آئے۔ مگر انہیں دونوں جانب سے حوصلہ شکنی کا سامنا ہے اور وہ بیک وقت "قدامت پرستی" اور "تجدد پسندی" کے طعنوں کا ہدف ہیں۔ مجھے ان نوجوان اہل علم سے ہمدردی ہے میں ان کے دکھ اور مشکلات کو سمجھتا ہوں اور ان کی حوصلہ افزائی کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں"۔

(حدود وتعزیرات ص۱۳)

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ عالمی ماحول اور جدید گلوبلائزیشن کے وہ کون سے تقاضے ہیں، جن کا مولانا زاہد الراشدی صاحب بار بار ذکر کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ قدیم وجدید میں تطبیق اور قابل قبول صورت نکالنے کے خواہاں ہیں۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے۔ جب نعوذ باللہ اس سے پہلے اسلامی احکام جدید دور کے تقاضوں پر پورا نہ اترتے ہوں اور اب ان کو جدید کے مطابق بنانے کے لئے کوئی ایسی صورت نکالی جائے اور وہ صورت بھی قابل قبول ہو۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون سی اتھارٹی ہے جو قبولیت کے اس معیار کو مقرر کرے گی۔ ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ یہ "دیباچہ" حدود وتعزیرات کی ایک ایسی کتاب کے لئے لکھا گیا ہے۔ جس میں

مغرب واہل استشراق کی طرف سے اسلامی حدود پر کئے گئے اعتراضات کو عملی جامہ پہنانے انہیں اسلامی احکام کا لبادہ اوڑھانے اور پوری فقہ اسلامی کو مشکوک بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مولانا ایسے مرعوب ذہنوں کے دکھ درد اور مشکلات کو بھی سمجھتے ہیں اور دینی احکام کی کتر و بیونت پر ان کی حوصلہ افزائی کو اپنی دینی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ الشریعہ کے زیرِ تبصرہ شمارے میں ایک کالم نگار تبلیغی جماعت کے متعلق لکھتے ہیں۔

13: "**تبلیغی جماعت کے لوگوں کی سادگی واخلاص** اور محنت اپنی جگہ، لیکن اسلام کے کسی ایسے تصور کو صحیح کیسے سمجھا جا سکتا ہے جو امت کی اجتماعی سیاسی اور تہذیبی زندگی سے صرف نظر کرتا ہو۔ اسے اہمیت نہ دیتا ہو اور ان پر منفی طور پر اثر انداز ہونے والے عوامل کے رد کو نہی عن المنکر کے اسلامی تصور کا حصہ نہ سمجھتا ہو۔ لہذا اہم تبلیغی جماعت اور اس سے ملتی جلتی تنظیموں کو اسلامی حوالے سے امت مسلمہ کے سیاسی اور تہذیبی مستقبل کے تناظر میں غیر مفید بلکہ نقصان دہ سمجھتے ہیں"۔ (ص 20,21)

حالانکہ وقت کے تمام اکابر نے تبلیغی جماعت کے کام پر اطمینان کا اظہار کیا ہے تبلیغی جماعت امت کی اجتماعی سیاسی اور تہذیبی زندگی سے صرف نظر نہیں کرتی بلکہ افراد پر محنت کر کے اس کے لئے ماحول اور راہ ہموار کرتی ہے وہ ایسے افراد مہیا کرتی ہے جو اپنی نظریاتی وفکری زندگی کے ساتھ ساتھ عملی زندگی میں بھی اسلامائزیشن کے داعی ہوں۔ آپ کی سیاسی وفکری تنظیمیں اور افراد نے مل کر بھی اس دور میں اتنے نظریاتی و عملی زندگی سے بہرہ ور افراد مہیا نہیں کئے۔ جتنے ایک تبلیغی جماعت نے اخلاص وللّٰہیت کو سامنے رکھتے ہوئے کئے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں انہوں نے

اسلامی لگن اور فکر کو عام کیا ہے اس دور کے "نام نہاد" فکری ونظریاتی افراد اور تنظیموں کے نام ونمود اور چودھراہٹ کی خاطر، اسلامی سیاست، نظریات وفہم اور تدبر کے حوالے سے معاشرے میں جو پیچیدگیاں اور الجھنیں پیدا کی ہیں۔ انہوں نے امت کو انتشار وتشتت کے علاوہ اور کیا دیا ہے۔ مثال کے لئے خود مضمون نگار مولانا زاہد الراشدی صاحب، عمار خان ناصر اور غامدی جیسے افراد ان کی اکیڈمیوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

ایک صاحب مجاہدین کے جذباتی رویہ پر تنقید کرتے ہیں اور انہیں اسلامی احکام کی پاسداری کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن خود ان کا اپنا اسلوب اسلامی احکام پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ ہے۔

14: "**دارالحرب ودارالاسلام کی تقسیم** کون سی آسمان سے نازل شدہ ہے کہ جس کا خلاف جائز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فقہاء نے اپنے زمانوں میں مسلمانوں کو بعض مسائل سمجھانے کے لئے یہ تقسیم پیش کی تھی کہ جس کی شریعت سے سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔ (ص:88)

الشریعہ کے اربابِ اہتمام کی تحریروں اور الشریعہ کی فائلوں میں دینی طبقوں کے لئے "روایتی" "قدیم" "کلاسیکل" "قدامت پسند" "رجعت پسند" وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے اور اپنی تحریروں کو زرق برق بخشنے اور پرکشش بنانے کے لئے دیگر تجدد پسندوں کی طرح یہ حضرات بھی "عالمی ماحول" "عالمی ثقافت وتہذیب" "جدید قانونی فکر" "قدیم وجدید" "گلوبلائزیشن کے ثقافتی تقاضے" وغیرہ جیسے مغرب

سے درآمد شدہ اصطلاحات کا استعمال کرتے ہیں اور یہی ان کا منبع علم ہے۔ مصر میں بھی جدت پسندوں نے انہی اصطلاحات وتعبیرات کا استعمال کیا اور اسی کو انہوں نے کامیابی کا زینہ سمجھا۔

اس طرح کے تجاوزات اگر غیر مقلد، منکر حدیث، مودودی فکر سے وابستہ یا ان کے علاوہ کوئی اور آزاد منش لوگ کرتے تو ہماری طرف سے ان کی سختی سے تردید کی جاتی اور عوام الناس کو اس سے دور رہنے کی تلقین کی جاتی لیکن کیا مولانا زاہد الراشدی صاحب اور ان کے بیٹے عمار خان ناصر کو دین اور اسلامی روایات کو توڑنے پھوڑنے کی اجازت اس لئے حاصل ہے کہ وہ ایک امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر صاحب کے علی الترتیب بیٹے اور پوتے ہیں۔ جب کہ خود حضرت کی شبانہ روز کوششیں باطل عقائد ونظریات کا قلع قمع کرنے میں صرف ہوئی ہیں۔ ہم اس وقت وہی بات دہرائیں گے جو مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے تسامحات پر تنقید کرتے ہوئے کہی تھی۔

''میرا تو مقصود ہی اس سے ع ''حدی را تیز تر می خواں چو ذوق نغمہ کم یابی تھا'' یہی بتانا چاہتا تھا کہ خواہ وہ ہماری جماعت ہی کا آدمی کیوں نہ ہو۔ لوگوں میں اس کی بڑائی جس حد تک بھی مسلّم ہو۔ لیکن حق کا قدم جب درمیان میں آئے گا تو پھر کسی کا لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ خواہ وہ کوئی ہو۔'' ولو ان فاطمۃ بنت محمد اعاذها اللّٰہ تعالٰی سرقت لقطعت یدها'' ہمارے دین کا امتیازی نشان ہے۔

(پرانے چراغ، حصہ اول، ص ۸۷)

ہم سب سے پہلے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے اکابر سے گزارش

کرتے ہیں کہ مولانا زاہد الراشدی صاحب وفاق کی ''مجلس عاملہ'' کے رکن ہیں۔ لہذا وہ حضرات انہیں فکری کجروی سے روکیں، اکابر دیوبند کے طرز فکر پر رہنے کی تلقین کریں اور اس کی پاسداری کا ان کو پابند بنائیں۔

اسی طرح ہمیں ''مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ'' کے اصحاب اہتمام سے بھی شکوہ ہے کہ ان کے شیخ الحدیث کی نگرانی میں اسلامی حدود سے تجاوزات اور انہیں موضوع بحث بنا کر جس انداز سے چیلنج کیا جا رہا ہے۔ یہ اکابر دیوبند کے طرز واسلوب سے بھی میل نہیں کھاتا اور نہ ہی مدرسہ نصرۃ العلوم کے اکابر کے مزاج و مذاق اور اسلوب سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس پر انہوں نے ابھی تک کسی قسم کا نوٹس نہیں لیا۔ وہ انہیں سمجھائیں اور نصرۃ العلوم کے دینی ومسلکی وقار کو برقرار رکھیں۔

(بشکریہ: ماہنامہ ''وفاق المدارس'' ملتان، ربیع الاول ۱۴۳۰ھ مطابق مارچ 2009ء)

غامدیت کیا ہے؟

تاریخ اسلام میں اہل سنت والجماعت کے خلاف پیدا ہونے والے فتنوں میں سے قدیم فتنے رافضی، خارجی، معتزلہ اور دیگر بدعتی وغیرہ تھے۔ جن کی تفصیل کتب عقائد، شرح المقاصد، شرح مواقف، شرح عقائد وغیرہ میں موجود ہے۔ لیکن جدید دور کے جدید فتنوں مثلاً پرویزیت، قادیانیت، مودودیت، بریلویت، غیرمقلدیت (نام نہاد اہل حدیث) اور مماتیت کی طرح ایک نئے فتنے نے حال ہی میں روشن خیالی اور تجدد پسندی کی کوکھ سے ناجائز بچہ کی طرح جنم لے کر غامدیت کے نام سے سر اٹھا کر مسلمانوں میں گمراہی پھیلانے میں مصروف عمل ہو چکا ہے۔

محققین کی رائے کے مطابق غامدیت: جس کا اصل مقصد قرآن و سنت کی پاکیزہ تعلیمات میں فتنہ پروری رخنہ اندازی کے ذریعہ سے بگاڑ وفساد، شکوک وشبہات پیدا کر کے دین اسلام کے روشن عقائد ونظریات کو تجدد اور آزاد خیالی کی سیاہی سے مسخ کرنے کی ناکام کوشش کا دوسرا نام ہے۔ (الامان والحفیظ)

مختصر تعارف چونکہ اس فتنہ کو نہ معلوم کن وجوہات اور مفادات کی بناء پر حکومت کی زبردست سرپرستی حاصل ہے۔ ڈاکٹر جاوید احمد غامدی جوکہ ضال ومضل آدمی بدقسمتی سے ''اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کا ممبر''، ٹی وی کا ''نام نہاد سکالر''

ماہنامہ ''اشراق'' کا مدیر، بے دین لوگوں کا ''رہبر'' اور یہودیت کے ایماء پر چلنے والے ''ادارہ المورد'' کا بانی ہے۔

ڈاکٹر غامدی علماء کی نظر میں: حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہ العالی اپنے رسالہ ''**تحفہ غامدی**'' میں ارشاد فرماتے ہیں ''کہ اگر ہم مختصر ترین الفاظ میں غامدی صاحب کے بارہ میں تبصرہ کریں تو وہ یہ ہے کہ جو شخص بہت سی باتوں میں یہ سمجھتا ہے کہ چودہ صدیوں سے پوری اُمت گمراہی وضلالت میں مبتلا رہی اور جو دلیل کے نام کا استحصال کرتا ہے تو شریعت کا ہی نہیں بلکہ عقل ودانش کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ وہ شخص عقل وسمجھ سے بالکل عاری ہے۔''

ہماری کوشش ''یہی ہے کہ کوئی بات حق کے دائرے سے متجاوز نہ ہو کہیں کہیں ہمارے الفاظ میں ترشی ملے گی۔ لیکن غامدی صاحب تہذیب وثقافت کو بالائے طاق رکھ کر ہمارے بڑے یعنی آئمہ مجتہدین، فقہاء اور محدثین ؒ کو بہت کچھ کہہ جائیں تو یہ بھی تو غیرت کے منافی ہے کہ آدمی پر اس کا کچھ اثر نہ ہو۔ اس لئے ہمارے الفاظ ترش نظر آئیں تو ہمیں اس پر معذور سمجھیں اور ان کا ذمہ دار بھی غامدی صاحب کو ہی سمجھیں'' تحفہ غامدی، ص۲۰ (مزید فرماتے ہیں کہ)

چیونٹی کو لگے پر تو کہنے لگی اُڑ کر
ہم بھی مثل سلیمان ہیں ہوا میں کئی دن سے

نیز فرماتے ہیں کہ غامدی صاحب کے برعکس ہمارا جس گروہ سے تعلق ہے اس کے بارہ میں غامدی صاحب لکھتے ہیں۔ ''ایک گروہ اس بات پر مصر ہوا کہ نہ دین کو

خاص اپنے مکتب فکر کے اصول ومبادی اور اپنے اکابر کی رائے سے بالاتر ہو کر براہ راست قرآن وسنت سے سمجھنا ممکن ہے اور نہ ہی مغربی تہذیب اور اس کے علوم اس کے مستحق ہیں کہ وہ کسی پہلو سے اہل دین کی نظروں میں ٹھہریں۔اس گروہ کے بڑوں میں قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، محمود الحسن دیوبندی، انور شاہ کشمیری، حسین احمد مدنی، اشرف علی تھانوی اور شبیر احمد عثمانی رحمہم اللہ کے نام بہت نمایاں ہیں"۔

"اس گروہ کی عمر پوری ہو چکی۔اس کی مثال اس فرسودہ عمارت کی سی ہے جو نئی تعمیر کے وقت آپ سے آپ ویران ہو جائے گی"۔غامدی کی کتاب "مقامات" ص ۱۸

"خیر آئندہ پردہ عدم سے وجود میں کیا آتا ہے یہ ہم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔البتہ غامدی صاحب کے ذکر کردہ سبق نے ہمیں اس کے بارے میں کلام کرنے کی ایک مشترکہ بنیاد فراہم کر دی ہے"۔الخ　　"تحفہ غامدی" ص ٦

امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ ترجمان اہل سنت مولانا عبدالحق خان بشیر مدظلہ ماہنامہ "الشریعہ" گوجرانوالہ کی اشاعت خاص جولائی تا اکتوبر 2009ء میں غامدی صاحب اور حافظ عمار خان ناصر کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

فکری المیہ

عصر حاضر کا سب سے بڑا فکری ونظریاتی المیہ یہ ہے کہ اس عہد جدید میں ایک طرف تو اسلام کے متواتر واجماعی عقائد کی حقیقت پسندانہ اور واقفیت پر مبنی تعبیر و تشریح کا پرچار کرنے اور اس ذریعہ سے دور حاضر کی امت مسلمہ کا فکری ونظریاتی رشتہ قرون اولیٰ سے جوڑنے والے اصحاب علم وفکر علماء ودانشور تو قضاوقدر کے ہاتھوں مجبور ہو کر تیزی کے ساتھ یہ دنیا خالی کر رہے ہیں۔جس سے علم وفکر کی مسندیں ویران ہو رہی ہیں۔جب کہ دوسری طرف ان کی جگہ پروفیسرز، ڈاکٹرز اور جدید تعلیم یافتہ نام نہاد دانشوروں کا وہ جدت پسند طبقہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ مفکرین اسلام اور مذہبی اسکالروں کی صورت میں سامنے آ رہا ہے یا ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت سامنے لایا جا رہا ہے۔جو نئی روشن خیالی کے دلفریب وگمراہ کن عنوان سے اسلام کی وہ مسخ شدہ تصویر پیش کر رہا ہے۔جس کے خدوخال کا کوئی بھی پہلو قرون اولیٰ کے اعتقادی تصور اور اہل سنت والجماعت کے متواتر واجماعی فکر سے کسی قسم کی فکری و نظریاتی مطابقت نہیں رکھتا۔جدید مفکرین کا یہ گروہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام

دشمن قوتوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا ہے اور اپنے جدید فکر و فلسفہ اور اپنے خود ساختہ اصولوں کے ذریعہ امت مرحومہ کا فکری رشتہ قرون اولیٰ اور اہل سنت کے متواتر واجماعی فکر سے کاٹ دینا چاہتا ہے۔ اگرچہ ایسے جدت پسند ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں، لیکن اس دور میں تو عالم اسلام میں بالعموم اور برصغیر میں بالخصوص برساتی مینڈکوں کی طرح برآمد و نمودار ہو رہے ہیں۔

ہمارے ملک کے اندر جدت پسند تحریکوں کی پشت پر اسلام دشمن مغربی قوتیں، اشتراکیت کی ہم نوا اسیکولر لابیاں اور اس ملک کی پچانوے فیصد اکثریت اہل سنت والجماعت کو ان کے آئینی وقانونی حق سے محروم کر دینے کی سازش کرنے والے کچھ مذہبی طبقات موجود ہیں۔ ارباب فکر و دانش کے لئے اس پہلو پر غور و فکر اور توجہ کرنے کی شدید ضرورت ہے کہ وہ اس بات کا کھوج لگائیں کہ کون سا خفیہ ہاتھ، کن خفیہ مقاصد کے لئے ان جدت پسند الحادی تحریکوں کے الحادی نظریات کے فروغ اور ان کی اشاعت کے لئے کروڑوں ڈالر کا ماہانہ خرچہ برداشت کر رہا ہے؟ بے حیائی، فحاشی، عریانی اور اخلاقی تباہی کو فروغ دینے والے جن ٹی وی چینلز پر اہل حق کو اپنا موقف ونظریہ اور اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کے لئے چند منٹ کا وقت حاصل کرنا بھی دشوار ہے اور انٹرویوز کے دوران بھی ان کے نقطۂ نظر کا اصل حصہ وقفہ کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ ان ٹی وی چینلز پر جدید مفکرین کی گھنٹوں گفتگو کا بل آخر کون ادا کرتا ہے؟ اور کن مقاصد کے لئے؟ الخ.........

مزید فرماتے ہیں کہ یہ روشن خیال و جدت پسند طبقہ اپنے فکر و فلسفہ کے

ذریعہ جو مذموم مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے وہ کسی بھی ہوش مند و باشعور مسلمان سے مخفی و پوشیدہ نہیں۔ وہ اس فکر و فلسفہ کے ذریعہ قرآنی و نبوی علوم و افکار کو اپنے خود ساختہ تحقیقی اصولوں کی بھٹی میں جھونکنا چاہتا ہے اور ان کو اپنے تحقیقی تجربات کے لئے تختہ مشق بنا کر نئے نئے افکار و نظریات منظر عام پر لانا چاہتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ شہرت بھی حاصل ہو سکے اور ڈالر بھی۔ اُمت مسلمہ کی وحدت کو پارہ پارہ بھی کر سکے اور اس کا علمی و فکری رشتہ اس کے اسلاف سے بھی کاٹ سکے۔ خدا تعالیٰ ہر قسم کے روشن خیال جدت پسندوں کے شر ورفتن سے اُمت مسلمہ کی حفاظت فرمائے۔ آمین یارب العالمین

حافظ محمد عمار خان ناصر کی علمی بے راہ روی

میرے انتہائی پیارے عزیز اور بھتیجے (برادر مکرم علامہ زاہد الراشدی مدظلہ کے فرزند) حافظ محمد عمار خان ناصر بچپن ہی سے خداداد ذہانت کے مالک ہیں۔ قدرت نے انہیں بے پناہ ذہانت سے نوازا ہے۔ وہ بلا کا حافظہ رکھتے ہیں اور بچپن سے مطالعہ کا بھی ذوق و جنون ہے اور یہ فطرت کا قانون ہے کہ اگر کسی ذہین و فطین آدمی کو تربیتی سختیوں سے آزاد کر دیا جائے اور اسے نگرانی کے حصار میں نہ رکھا جائے تو اس کے بہکنے کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے۔ اور اس کے فکری بے راہ روی کا شکار ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ الخ.........

اجماع کے بارہ میں عمار خان ناصر کی علمی ٹھوکر

عزیزم عمار خان ناصر کافی عرصہ سے ڈاکٹر جاوید احمد غامدی کی روشن خیال تحریک سے وابستہ ہیں اور اس وابستگی کے بعد ان کا تمام تر مطالعہ اسی فکر و نظر کے

حوالہ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک کتاب "حدود وتعزیرات، چند اہم مباحث" کے نام سے لکھی جو غامدی صاحب کے ادارہ "المورد" سے شائع ہوئی۔ اس میں دیت اور زانی کی سزا کے بارے میں جو موقف اختیار کیا گیا ہے وہ خالص غامدی نقطہ نظر ہے جسے کسی صورت بھی اہل سنت والجماعت کا موقف تسلیم نہیں کیا جاسکتا اور خود عزیزم عمار کو بھی اس پر اصرار نہیں کہ وہ جمہور اہل سنت کا موقف ہے۔ وہ بھی اسے جمہور کے خلاف اپنی ایک رائے قرار دیتے ہیں۔

مخدوم ومکرم حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہ

جامعہ مدنیہ لاہور نے اس پر گرفت کی اور "مقام عبرت" کے نام سے ایک رسالہ تالیف فرمایا اور ہمیں اس بات کا اعتراف واعلان کرنے میں کوئی باک وعار نہیں ہے کہ ان کی گرفت جمہور اہل سنت والجماعت کے اصول ومسلک کے عین مطابق ہے اور حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ کے مسلک وطرز تحقیق سے بھی مکمل مطابقت رکھتی ہے اور ہم ان کی طرف سے اس عالمانہ وناصحانہ گرفت پر ان کے انتہائی ممنون وشکر گزار ہیں۔ عزیزم ناصر صاحب نے اس کے جواب میں ایک رسالہ "مفتی عبدالواحد صاحب کی تنقیدات کا جائزہ" تحریر کیا اور اس میں مفتی صاحب مدظلہ کی طرف سے اٹھائے گئے خالص علمی اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی۔ ہمارے خیال میں اسے لفظی ہیر پھیر کا نام تو دیا جاسکتا ہے لیکن جواب تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ باقی ابحاث تو فی الوقت ہم وقت کا ضیاع ہی سمجھتے ہیں کیونکہ جب تک کسی بنیادی اصول پر اتفاق ہی نہ ہو، ذیلی بحثوں کے چھیڑنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ عزیزم عمار ان مسائل میں بہت بڑی علمی ٹھوکر کھا چکے ہیں اور کھارہے ہیں۔ الخ......

اجماع اُمت کے بارے میں

عزیزم عمار کی ذہنی کیفیت اور ان کے طرز استدلال کو سامنے رکھ لیجئے کہ وہ جس اجماع کے وقوع ووجود کا کسی بھی پہلو سے کوئی امکان تسلیم نہیں کرتے۔ اس کے بارے میں "دو ذہنی" کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایک طرف قرآن وسنت کے بنیادی تصورات واحکام میں اجماع کو ممکن مانتے ہیں اور دوسری طرف نصوص واحکام کی تعبیر وتشریح میں اجماع کو غیر ممکن قرار دیتے ہیں۔ ان کے مذکورہ مفروضات واستدلالات کی روشنی میں ایک پہلو ممکن اور دوسرا کیسے ناممکن ہے؟ یہ فلسفہ ہمارے فہم سے بالا ہے۔ اس کی وضاحت وہی کر سکتے ہیں۔ البتہ اس مقام پر ان کا یہ "انکشاف" نہایت افسوس ناک ہے کہ جس اجماع کو آج تک پوری امت مسلمہ ایک "شرعی دلیل" کے طور پر پیش کرتی رہی ہے۔ اس اجماع کو وہ "محض نفسیاتی دلیل" قرار دے کر اس کا مذاق اڑا رہے ہیں اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ وہ اجماع کو "علمی افسانہ" ثابت کرنے کے شوق میں چودہ سو سالہ اسلاف امت کے تحقیق ومطالعہ کو محدود وسطحی اور عامیانہ قرار دے کر "المورد" کی علمی وفکری لامحدودیت اور برتری کو ثابت کرنے کے چکر میں ہیں۔ عزیزم عمار کو اس پہلو پر نہایت سنجیدگی سے اپنے طرز فکر کا جائزہ لینا چاہیے۔ ہمارے خیال میں عزیزم عمار نے جو اتنی بڑی علمی ٹھوکر کھائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بعض اہم بنیادی حقائق کی طرف توجہ نہیں دے سکے۔ ہم ان حقائق کی طرف ان کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ شاید اس طرح وہ اپنے افکار ونظریات پر از سر نو نظر ثانی

کر سکیں۔ الخ..........

مزید فرماتے ہیں کہ ہر صاحب علم وشعور اس حقیقت سے واقف و باخبر ہے کہ قرون اولی سے اہل سنت والجماعت کے ہاں اجماع دلائل شرعیہ میں سے ایک مستقل دلیل تسلیم کیا گیا ہے اور چودہ سو سال سے اس دلیل کے ذریعے بے شمار افکار و احکام کا اثبات کیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا چودہ صدیوں سے جس دلیل کے ذریعہ ان گنت مسائل کے اثبات ونفی کا کام لیا گیا ہے وہ محض ایک ''مفروضہ'' اور ''علمی افسانہ'' ہے۔؟ اور پھر عزیزم عمار کو یہ پہلو بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ انہوں نے جب آئمہ کی عبارات سے استدلال کیا ہے وہ خود ''اجماع'' کو دلیل مانتے ہیں اور چاروں آئمہ مجتہدین دو چیزوں پر اصولی اتفاق رکھتے ہیں۔ پہلی یہ کہ اصول اہل سنت، اصول فقہ اور دلائل شرعیہ چار ہی ہیں اور دوسری یہ کہ قرآن وسنت اور اجماع کے مقابلہ میں کسی مجتہد کو اجتہاد کا حق حاصل نہیں۔ آخر وہ کون سا اجماع ہے جس کے مقابلہ میں کسی بھی مجتہد کے لئے اجتہاد کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور جس کے منکر کو فقہاء کرام کافر یا اہل سنت والجماعت سے خارج قرار دیتے ہیں؟

چودہ صدیوں سے اجماع کے بالمقابل کسی کی رائے کو قبول نہیں کیا گیا۔ اس کے مقابلہ میں رائے دو ہی قسم کی ہو سکتی تھیں یا بغاوت یا اجتہادی لغزشیں۔ بغاوت وسرکشی کو تو ہمیشہ گمراہی وضلالت قرار دیا گیا ہے۔ البتہ اجماع کے مقابلہ میں کسی مسلمہ بزرگ کی رائے کو تفرد قرار دیا گیا ہے یعنی یہ رائے تو بہر حال غلط ہے۔ لیکن اس کے پیچھے صاحب رائے کی بدنیتی ثابت نہیں ہو سکی۔ اس لئے اس پر اسے مطعون

نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ عزیزم عمار کو بھی اس پر شکوہ ہے کہ کسی کی رائے کو تفرد قرار دے کر اس کی حیثیت کمزور کرنا مناسب نہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

عام طور پر اہل علم کی ایسی آراء کو تفرد کہہ کر ان کی علمی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، حالانکہ ان آراء کو جزوی اطلاق کے لحاظ سے تو تفرد کہا جا سکتا ہے لیکن یہ کسی علمی بے اصولی یا تحقیقی اور بنیادی مسلمات سے انحراف پر مبنی نہیں ہوتیں بلکہ مسلمات کے دائرہ میں معروف و مانوس علمی اصولوں ہی کے ایک نئے اطلاق سے وجود میں آتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حتمی نہیں ہوتیں اور سابقہ آراء کی طرح ان سے بھی اتفاق یا اختلاف کی پوری گنجائش موجود ہوتی ہے لیکن محض اچھوتا ہونے کی بناء پر انہیں علمی روایت سے انحراف قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ (تنقیدات کا جائزہ، ص۲۲)

عزیزم عمار کا یہ کہنا کہ اجماع کے مقابلہ میں کسی شخص کی رائے سے اتفاق یا اختلاف کی اتنی گنجائش ہوتی ہے جتنی کہ سابقہ یعنی اجماعی آراء سے اتفاق واختلاف کی۔ بہر حال محل نظر ہے، کیونکہ ایک رائے پر (اگر بقول عزیزم عمار اجماع کی معروف تعریف اس پر نہ بھی تسلیم کی جائے) کثیر اہل علم وتحقیق کا اتفاق ہے اور دوسری رائے فرد واحد کی ہو۔ دونوں سے اتفاق واختلاف کی مساویانہ گنجائش ناقابل فہم ہے۔ اور پھر شخصی رائے کو اجماع کے مقابلہ میں علمی بے اصولی یا تحقیقی وبنیادی مسلمات سے انحراف تسلیم نہ کرنا بھی اسی وجہ سے ہے کہ عزیزم عمار اجماعی واتفاقی رائے تسلیم کرنے کی بجائے اسے صرف معروف و مانوس قرار دیتے ہیں۔ بہر حال ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ اجماعی رائے یا بقول عزیزم عمار معروف و مانوس رائے کے مقابلہ میں تفردات کو

بھی کبھی قبول نہیں کیا گیا۔ چنانچہ

برادر مکرم حضرت مولانا علامہ زاہد الراشدی مدظلہ فرماتے ہیں

کہ ''آج کے نوجوان اہل علم جو اسلام کے چودہ سو سالہ ماضی اور جدید گلوبلائزیشن کے ثقافتی ماحول کے سنگم پر کھڑے ہیں وہ نہ ماضی سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں اور نہ مستقبل کے ناگزیر تقاضوں سے آنکھیں بند کرنے کے لئے تیار ہیں۔ وہ اس کوشش میں ہیں کہ ماضی کے علمی ورثہ کے ساتھ وابستگی برقرار رکھتے ہوئے قدیم وجدید میں تطبیق کی کوئی قابل قبول صورت نکل آئے مگر انہیں دونوں جانب سے حوصلہ شکنی کا سامنا ہے۔ اور بیک وقت قدامت پسندی اور تجدد پسندی کے طعنوں کا ہدف ہے۔ مجھے ان نوجوان اہل علم سے ہمدردی ہے، میں ان کے دکھ اور مشکلات کو سمجھتا ہوں اور **''ان کی حوصلہ افزائی کو اپنی دینی ذمہ داری سمجھتا ہوں''**

صرف ایک شرط کے ساتھ کہ امت کے اجتماعی تعامل اور اہل سنت و الجماعت کے علمی مسلمات کا **دائرہ کراس نہ ہو**، کیونکہ اس دائرے سے آگے بہر حال گمراہی کی سلطنت شروع ہو جاتی ہے''۔ (حدود و تعزیرات، ص ۱۳)

برادر محترم علامہ راشدی مدظلہ کے مذکورہ ہمدردانہ و دردمندانہ موقف میں چند تحفظات کے باوجود ہمیں ان کی اس شرط سے کلی اتفاق ہے کہ امت کے اجتماعی تعامل میں اہل سنت والجماعت کے علمی مسلمات کا دائرہ کراس کرنے والے ''تفردات'' کو نہ پہلے کبھی قبول کیا گیا ہے اور نہ اب اس کی کوئی گنجائش ہے۔ کیونکہ اس سے آگے گمراہی کی سلطنت شروع ہو جاتی ہے۔ اور تفردات گمراہی کب بنتے

ہیں؟ جب انہیں اپنی ذات سے باہر لا کر ان کی اشاعت و ترویج کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ زاہد الراشدی مدظلہ فرماتے ہیں کہ

''اور تفردات کے بارے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ یہ ہر صاحب علم کا حق ہے جس کا احترام کیا جانا چاہیے۔ بشرطیکہ وہ ان کی ذات یا ان کے حلقہ تک محدود رہے۔ البتہ اگر کسی تفرد کو جمہور اہل علم کی رائے کے علی الرغم سوسائٹی پر مسلط کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ فکری انتشار اور ایک نئے مکتب فکر کے قیام کا سبب بنتا ہے اور یہی وہ نقطہ اور مقام ہے جہاں ہمارے بہت سے قابل قدر اور لائق احترام مفکرین نے ٹھوکر کھائی ہے اور امت کے اجتماعی علمی دھارے سے کٹ کر جداگانہ فکری حلقوں کے قیام کا باعث بنے ہیں۔ (ایک علمی و فکری مکالمہ، ص ۱۲)

یعنی تفردات کو جب پبلک کے اندر لانے کی کوشش کی جائے تو وہ ایک نیا مکتب فکر بن کر گمراہی کا باعث بنتے ہیں لیکن اس مقام پر ہمیں

برادر مکرم مولانا زاہد الراشدی مدظلہ کے اس موقف سے شدید اختلاف ہے

کہ ''تفردات ہر صاحب علم کا حق ہے'' ہمارے خیال میں تفردات کا قائم کرنا حق نہیں ہے، معذوری ہے۔ کیونکہ حق قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دروازے ہمیشہ کے لئے ہر صاحب علم کے لئے کھلے ہیں۔ جب کہ ہمارا موقف یہ ہے کہ ماضی کے اہل علم کے تفردات کو ان کا حق تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ ان کی معذوری قرار دیا گیا ہے اور خود برادر مکرم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ امت کے اجتماعی تعامل اور اہل سنت والجماعت کے علمی مسلمات کا دائرہ کراس کر کے آگے گمراہی کی سلطنت شروع ہو جاتی ہے اور ان مسلمات کے بالمقابل رائے و تفرد کو اگر سوسائٹی تک

لے آیا جائے تو فکری انتشار کے ساتھ ایک نیا مکتب فکر جنم لیتا ہے۔الخ.........

امام اہل سنت رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک اعتدال اور عمار خان ناصر

عزیزم عمار خان ناصر کافی عرصہ سے ڈاکٹر جاوید احمد غامدی کی روشن خیال تحریک سے وابستہ ہیں اور اس وابستگی کے بعد تمام تر مطالعہ غالباً اسی فکر و نظر کے حوالہ سے ہوتا ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی کتب کا مطالعہ بھی اسی تناظر میں کیا ہے اور اس مطالعہ کے ذریعہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے فکر و موقف کو سمجھنے کی بجائے غامدی صاحب کے جدت پسندانہ طرز فکر کے لئے دفاعی مواد تلاش کرنے اور اس کے لئے جواز کی صورتیں پیدا کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد عزیزم عمار کے قلم سے اس کا جو نتیجہ سامنے آیا ہے، اس میں حقیقت پسندانہ رنگ کہیں نظر نہیں آتا اور شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ حقیقی و واقعی نتیجہ اخذ کرنے سے محروم و قاصر رہے ہیں۔ غالباً ان کی اس ساری کاوش کا محور غامدی صاحب کی علمی حیثیت کو مسلم کرانا ہے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کے کسی زیر تسوید مضمون کا ایک اقتباس ہفت روزہ ''وزارت'' لاہور کی ۱۰ تا ۲۳ جون ۲۰۰۹ء کی اشاعت میں ''امام اہل سنت رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک اعتدال'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ جس میں فرماتے ہیں کہ

امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ اپنی آراء و نظریات میں جمہور اہل علم کے موقف کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ کسی بھی علمی یا فقہی مسئلہ میں جمہور امت جس رائے کی تائید کریں وہ اقرب الی الحق اور

قرین صواب ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں زیر بحث آنے والے کم و بیش تمام مسائل کی تحقیق میں اس زاویہ نگاہ کو ملحوظ رکھا ہے اور اپنے تلامذہ اور متعلقین کو بھی یہی ہدایت کرتے تھے کہ مختلف گمراہ کن نظریات کے اثرات سے بچنے کے لئے جمہور علمائے امت کی تحقیقات کا دامن تھامے رکھنا ہی محفوظ ترین اور محتاط ترین راستہ ہے۔ تاہم اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جسے وہ پورے اعتدال اور توازن کے ساتھ ملحوظ رکھتے تھے۔ وہ اس نکتہ کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے کہ بلند فکری اور ذہنی معیار رکھنے والے اہل علم اور محققین بسا اوقات کسی مسئلہ میں عام رائے پر اطمینان محسوس نہیں کرتے اور ان کا غور و فکر انہیں معروف و مانوس نقطہ نظر سے مختلف رجحان اختیار کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ ایسے اہل علم کے لئے جن کی علمی حیثیت مسلم ہو، عام آراء سے اختلاف یا تفرد کا حق بھی پوری طرح تسلیم کرتے تھے، بشرطیکہ اس اختلاف کو علمی حدود میں رکھا جائے اور اس کی وجہ سے جمہور اہل علم پر طعن و تشنیع کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔

اس کے بعد عزیزم عمار نے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی بعض کتب سے چند اقتباسات و عبارات اور ان پر اپنے اخذ کردہ ذہنی تاثرات نقل کئے ہیں اور آخر میں اپنا حتمی ذہنی نتیجہ بایں الفاظ بیان کیا ہے کہ

''مذکورہ امور کی روشنی میں میرے نزدیک امام اہل سنت رحمۃ اللہ علیہ کے موقف اور نظریہ کی درست تعبیر یہ بنتی ہے کہ وہ اصولی طور پر جمہور اہل علم کی آراء و تعبیرات کو ہی درست سمجھتے اور اپنے لئے اس پابندی کو بالعموم ضروری تصور کرتے ہیں، تاہم اہل علم کے لئے دلائل کی روشنی میں انفرادی رجحانات کا حق بھی تسلیم کرتے تھے اور جمہور سے محض علمی اختلافات کو اہل سنت کے منہج سے انحراف یا گمراہی قرار نہیں دیتے تھے''۔

عزیزم عمار کے ذہن نے حضرت شیخ رحمہ اللہ کی چند عبارات سے جو نتائج اخذ کیے، وہ ہم نے بے کم وکاست نقل کر دیئے ہیں۔ ہم ان نتائج پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

نکتہ اولیٰ: اس مقام پر سب سے پہلا قابل توجہ نکتہ یہ ہے عزیزم عمار بڑے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ حضرت شیخ کا مختار، پسندیدہ اور تلقین کردہ مسلک وموقف اسلاف کی تحقیقات سے وابستہ رہنے اور دوسروں کو ان سے وابستہ رکھنے ہی کا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ گمراہ کن نظریات اور ان کے تباہ کن اثرات سے بچنے اور دیگر مسلمانوں کو ان سے بچانے کے لئے حضرت شیخ رحمہ اللہ کے نزدیک جمہور علمائے امت کی تحقیقات وتعلیمات سے وابستگی ہی محفوظ ترین اور محتاط ترین راستہ ہے۔ اور حضرت شیخ رحمہ اللہ کا یہ موقف ونظریہ کسی وقتی وہنگامی سوچ کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کے پیچھے ان کا ساٹھ سالہ تحقیق ومطالعہ اور غور وفکر کارفرما ہے۔ گویا یہ ان کی ساٹھ سالہ تحقیق ومطالعہ، غور وفکر اور تجربات ومشاہدات کا نچوڑ ہے۔ اس کے بعد بھی اگر ان پر علمی اعتماد کرنے والا کوئی شخص تحقیقات اسلاف کا محفوظ ومحتاط راستہ ترک کر کے کوئی غیر محفوظ وغیر محتاط راستہ تلاش کرے تو اسے کم سے کم درجہ میں اس کا غیر دانش مندانہ طرز ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

نکتہ ثانیہ: اس مقام پر دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ حضرت شیخ رحمہ اللہ کے نزدیک امت کے اجماعی مسلک اور جمہور امت کے مسلک میں بڑا واضح اور نمایاں فرق ہے۔ ان کے نزدیک اجماعی مسلک کا مطلب یہ ہے کہ اس موقف ونظریہ پر

پوری اُمت متفق ہے اور اس میں پہلے سے کسی قسم کا کوئی اختلاف موجود نہیں۔ ایسے کسی اجماعی مسئلہ میں حضرت شیخ رحمہ اللہ نہ صرف یہ کہ کسی کا حق اختلاف تسلیم نہیں کرتے، بلکہ اختلاف کرنے والے کو گمراہ اور اہل سنت سے خارج قرار دیتے ہیں اور مسلک جمہور کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں اُمت کے اہل علم وتحقیق کا اختلاف پایا گیا ہے اور اس اختلاف میں ایک طرف اہل علم کی اکثریت یعنی جمہور ہے اور دوسری طرف اہل علم کی ایک قلیل تعداد پائی گئی ہے۔ ایسے اختلافی مسائل میں حضرت شیخ رحمہ اللہ خود بھی مسلک جمہور پر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی مسلک جمہور پر عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ البتہ اگر کوئی اہل علم وتحقیق مسلک جمہور سے ہٹ کر کوئی دوسرا مسلک (جو پہلے موجود ہو) اختیار کرے تو اسے گمراہ اور اہل سنت سے خارج قرار نہیں دیتے اور اسے مسلک جمہور اور جمہور ائمہ اہل سنت پر زبان طعن کھولنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ عزیزم عمار نے ''سماع الموتی ص ۶۴'' سے حضرت شیخ رحمہ اللہ کا یہ موقف نقل کیا ہے کہ ''ہم جمہور کو شرع کی پانچویں دلیل نہیں مانتے۔ ادلہ شرعیہ چار ہی ہیں''۔ گویا جمہور کے مسلک پر عمل کرنا شرعی دلیل کے حوالے سے نہیں بلکہ شرعی احتیاط کے طور پر ہے، کیونکہ ہم کتنے ہی ذہین وفطین کیوں نہ ہوں، جمہور اہل علم کی رائے، علم وفہم اور امانت ودیانت کے اعتبار سے بہرحال ہماری رائے پر فائق وبرتر ہے، اس لئے قبول کر لینا ہی احتیاط کا تقاضا ہے اور ہمارے خیال میں اتبعوا السواد الاعظم کے فرمان نبوی میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ اختلافی مسائل میں امت کے سواد اعظم یعنی جمہور کی اتباع کی جائے۔

نکتہ ثالثہ: اس مقام پر تیسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ عزیزم عمار نے ایک جملہ اپنی عبارت میں ایسا لکھا ہے جس نے ہمیں چونکا دیا ہے اور اگر انہوں نے یہ جملہ شعوری طور پر لکھا ہے تو ہمارے نزدیک نہ صرف خطرناک ہے بلکہ گمراہ کن بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''بلندی فکر و ذہنی معیار رکھنے والے اہل علم و تحقیق اگر معروف و مانوس موقف کے خلاف کوئی رائے قائم کرلیں''۔ اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ

عزیزم عمار کے نزدیک جمہور اُمت کے معروف و مانوس مسلک پر عمل کرنے والے اہل علم نہ تو بلندی فکر رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کا ذہنی معیار ہے۔ کس قدر تعجب وحیرت کی بات ہے کہ اسلاف امت کے فکر تک رسائی حاصل کرنے والے تو بلندی فکر اور ذہنی معیار سے محروم ہیں اور اپنی ناقص و نارسا عقل سے سر ٹکرانے والے بلند فکر بھی ہیں اور ذہنی معیار بھی رکھتے ہیں۔ العیاذ باللہ۔

ہم عزیزم عمار کی توجہ بار بار اس **خطرناک جملہ** کی طرف دلانا چاہیں گے جس کا نتیجہ بظاہر یہ سامنے آتا ہے کہ **دادا تو بلندی فکر اور ذہنی معیار** دونوں سے محروم تھا، جبکہ **پوتا بلندی فکر** کی دولت سے مالا مال ہے اور ذہنی معیار کی نعمت سے بھی۔ اور ایسا شاید اس لئے ہوگیا ہے کہ دادا کی نسبت فکری طور پر **اسلاف اُمت اور بزرگان دیو بند** کی طرف ہے اور پوتا ڈاکٹر **جاوید احمد غامدی** جیسے مفکر اعظم سے فکری نسبت رکھتا ہے اور دونوں کا بھلا جوڑ ہی کیا ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ (از مرتب)

ہم لاکھ مہذب ہوں مگر تم ہی بتاؤ ☆ جب ضبط کا پیمانہ چھلکتا ہی چلا جائے

بشکریہ: ''الشریعہ'' خصوصی اشاعت، بیاد امام اہل سنت رحمہ اللہ، ص ۶۸۲ جولائی، اکتوبر 2009ء

حضرت مفتی ابولبابہ شاہ منصور مدظلہ، کراچی

فکری ارتداد یہ ہے کہ اللہ کے احکام (حدود اللہ) کی پامالی جو آج کے ''تھینک ٹینکس'' کا برپا کردہ عظیم ترین فتنہ ہے۔ اس سے جو وسوسے جنم لیتے ہیں ان کی بناء پر آدمی صبح کو مسلمان ہوتا ہے، شام کو کافر۔ شام کو مسلمان ہوتا ہے تو صبح کو کافر۔ اس فتنے کی ایک جھلک دیکھنی ہو تو حضرت علامہ دوراں **جاوید احمد غامدی** اور ان کے تیار کردہ لاجواب قسم کے باکمال فتنہ پردازوں کے پروگراموں میں دیکھ لیجیے۔ جہاں سیدھے سادھے نوجوانوں سے سوال ہوتے ہیں: خدا کا وجود ہے بھی یا نہیں؟ حدود کی تعریف کیا ہے اور یہ تعریف کس نے کی ہے؟ چہرے کے پردے کا تکلف کس نے جاری کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان لوگوں کی بدنصیبی یہ ہے کہ ان کے پروگراموں کی فہرست دیکھ لیجیے۔ ایک بھی تعمیری عنوان نہیں ملے گا۔ اصلاحی موضوعات سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ ان کا سارا زور تشکیک پھیلانے اور وسوسہ پیدا کرنے پر ہے۔ کوئی دنیادار مسلمان دین کی طرف آجائے۔ اس کی ان کو فکر نہیں۔ سارا زور اس پر ہے کہ جو بچے کھچے مسلمان دین پر ٹوٹا پھوٹا عمل کررہے ہیں وہ کسی طرح سے آزاد خیال ہوجائیں۔ طہارت کے مسائل نہ جاننے والوں کو علمی کلامی مباحث میں الجھانے کا آخر اور کیا مطلب ہوسکتا ہے؟

تو جنابِ من شراب و زنا کو حلال اور سود و جوئے کو جائز سمجھنے والے اور سنت نبوی ﷺ کو حقیر جاننے والے وہ بدنصیب روشن خیال ہوں گے جو حضرت مہدی کی تلوار کا شکار ہوں گے یہی فکری ارتداد کا انجام ہے۔ اللہ اپنی پناہ میں رکھے۔